اختر انصاری کی شاعری
کا
تنقیدی مطالعہ
فاطمہ پروین

اختر انصاری کی شاعری
کا
تنقیدی مطالعہ

فاطمہ پروین
بی۔ایس سی ایم۔اے، ایم فل (عثمانیہ)

○ اشاعت اول : ایک ہزار
○ اشاعت : ۱۹۸۰ء

○ ترتیب و تزئین : صاحبزادہ میر محمود علی خاں، ایم۔اے (عثمانیہ)
○ کتابت : جمیل القادر
○ سرورق : سلام خوشنویس

○ طباعت : عمر پریس (پرنٹو پریس) محبوب گنج۔ حیدرآباد

○ زیرنگرانی : ادارۂ 'شعر و حکمت'
○ باشتراک : اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

○ قیمت : ۱۵/- روپے

ملنے کے پتے :
○ بک ڈپو، اردو اکیڈمی، آندھرا پردیش، حیدرآباد
○ ادارۂ شعر و حکمت، لکڑی کا پل۔ حیدرآباد
○ الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد
○ علوی بک ڈپو، ۴۹۔ محمد علی روڈ، بمبئی ۳
○ مصنف : ۹۹۳-۶-۲۲ ایرانی گلی، حیدرآباد ۲

اِنتساب

پپّا صاحب اور امّی حضور کے نام

جن کی شفقت محبت اور تربیت نے

میرے ذوقِ تحصیلِ علم و تحقیق کو جِلا بخشی

مندرجات

حرفِ آغاز

جدید شعرائے اُردو میں اختر انصاری کی اہمیت اور انفرادیت مسلمہ ہے وہ جس پایہ کے شاعر ہیں اس درجہ کے افسانہ نگار اور نقاد بھی ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی لیکن اُردو میں ایسی ہمہ گیر شخصیتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اختر انصاری کا سب سے اہم اور ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قطعہ جیسی روایتی صنف کو نیا قالب اور نئی روح عطا کی۔ ان کے دیگر تخلیقی اور تنقیدی کارناموں سے صرفِ نظر بھی کیا جائے تو وہ صرف اپنے قطعات کی وجہ سے اُردو شعرا میں ایک نمایاں مقام پانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں اختر انصاری کی خدمت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ "افادی ادب" لکھ کر انھوں نے اس تحریک کو ایک نظریاتی قوت بخشی۔ ترقی پسند نظریۂ ادب کو جس وضاحت اور قطعیت کے ساتھ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کی مثالیں اُردو تنقید میں کم یاب ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ اس تحریک کے خط و خال پوری طرح متعین نہیں ہونے ہونے پائے تھے اور مختلف گوشوں سے اس کی مخالفت کی جا رہی تھی اختر انصاری نے ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے نہایت ہی مدلل پیرائے میں اس نظریۂ ادب کی وکالت کی۔ مختصر افسانے کی صنف میں بھی اختر انصاری کی تخلیقات کیفیت و کمیت ہر دو اعتبار سے لائقِ تحسین اور قابلِ قدر ہیں۔

مختصر یہ کہ اختر انصاری کے ذکر کے بغیر کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اختر انصاری کے تمام کارناموں کا تفصیل کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیا جائے لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ایک مقالے میں تمام اصناف میں ان

کی خدمات کا مکمل تحصیر ممکن نہیں اس مطالعے کو صرف شعری تخلیقات تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس مقالے میں اختر انصاری کی قطعہ نگاری کا جائزہ اس صنف سخن میں ان کی منفرد حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی قدر تفصیل سے لیا گیا ہے۔ کسی نقاد یا مورخ نے قطعہ کی صنف اور اردو میں اس کے ارتقاء کا جائزہ تشفی بخش طور پر نہیں لیا اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک باب اس کے لئے مختص کیا جائے تاکہ اختر انصاری کے کارنامے کسی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو۔ اگرچہ اختر انصاری کی تنقید نگاری ہمارے موضوع سے خارج ہے ان کی شاعری کی مناسب تحسین کے لئے ان کے نظریۂ ادب کا بھی مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

'اختر انصاری کی شاعری کے ادوار' کے عنوان ایک باب مختص کیا گیا ہے تاکہ بیک نظر ان کی شاعری کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہو سکے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کی مشفقانہ رہنمائی میں میں نے اس مقالے کو قلمبند کیا جس کے لئے میں موصوف کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں ان تمام معزز اساتذہ اور احباب کی ممنون کرم ہوں جنہوں نے اس مقالے کی تیاری میں میری ہمت افزائی کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

میں جناب چندر سری واستو سکریٹری / ڈائرکٹر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی بھی شکر گزار ہوں کہ جن کی توجہ کے باعث یہ مقالہ اشاعت کی منزل طے کر سکا۔

فاطمہ پروین

مقدمہ

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اُردو کے جن ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے ترقی پسند تحریک کی صحت مند نشوونما اور نظریہ سازی میں اہم حصہ لیا [illegible]، ان میں اختر انصاری کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی طرح اختر انصاری نے بھی اپنی تنقیدی نگارشات میں ادب اور زندگی کے درمیان پائے جانے والے فطری اور اٹوٹ رشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب کی جس افادیت پر زور دیا تھا وہ بڑی حد تک [illegible] کی [illegible] سے مطابقت رکھتی تھی۔ اسی تنقیدی شعور کی رہنمائی میں اختر انصاری نے تخلیقی کام انجام دیا۔ ان کے نظریہ اور عمل میں گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔

اختر انصاری نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ احمد ندیم قاسمی کی طرح اختر انصاری کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا افسانہ نگار۔ ہر دو اصناف میں انھوں نے جو تخلیقی شاہکار پیش کیے ہیں وہ یکساں

قدر وقیمت کے حامل ہیں پھر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں نے ان کے افسانوں میں اور افسانہ نگاری کے فن پر مہارت نے ان کی شاعری میں ایک ایسے رنگ کی آمیزش کردی جو اُردو شعر وادب کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ ان کے اسلوب میں جو ندرت اور تازگی آج بھی محسوس ہوتی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے۔

اختر انصاری اپنی نجی زندگی میں ایک سلیقہ شعار اور معیار پرست انسان ہیں۔ یہی سلیقہ شعاری اور معیار پرستی ان کے فن میں رچ بس گئی ہے۔ ان کی کوئی غزل کوئی نظم، قطعہ یا افسانہ لے لیجیے معیار کی پستی کہیں نظر نہیں آئے گی۔

اختر انصاری نے جس صنف کو چھوا اس پر اپنے اسلوب اور اپنی شخصیت کی گہری چھاپ لگا دی اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ان اصناف میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ کیا۔ جدید اُردو شعر وادب کو اختر انصاری کی جو دین رہی ہے اسے کوئی مورخ یا نقاد نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اختر انصاری کو سب سے زیادہ شہرت قطعات کی وجہ سے ملی۔ چار مصرعوں والے قطعے جو اختر انصاری نے تخلیق کیے وہ اُردو شاعری کے لیے بالکل نئی چیز تھے۔ ان تخلیقات کو وہ قطعہ نہ کہتے اور کوئی دوسرا نام دیتے تو اسے اُردو شاعری میں ایک نئی صنف تسلیم کرلیا جاتا اور وہ اس صنف کے موجد قرار پاتے۔

اختر انصاری ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود اس کی سیاست سے الگ رہے اور تحریک کی انتہا پسندی کے دور میں پروپگنڈے اور نعرہ بازی سے اپنے فن کو ملوث نہیں کیا۔ ان کی عزلت پسندی اور نام ونمود سے نفور کے علاوہ شاید یہ بھی ایک سبب ہے کہ اس دور کی تنقید نے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی۔ اس کے باوجود خواص اور عوام میں انھیں وہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی

جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ ادبی حلقوں میں بھی ان کا نام ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔

اختر انصاری کی ادبی خدمات کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ ان کے کارناموں کا مفصل تنقیدی جائزہ لے کر ان کی قدرشناسی کی جاتی۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی طالبہ فاطمہ پروین نے ام اے کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ ام اے کے مقالے عام طور پر امتحانی نقطۂ نظر سے تحریر کیے جاتے ہیں اور علمی سرمایہ کے حامل نہیں ہوتے۔ پھر دوسرے پرچوں کی تیاری بھی کرنی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مقالہ لکھنے پر پوری توجہ اور وقت صرف نہیں کرسکتے۔ ان رکاوٹوں اور مجبوریوں کے باوجود فاطمہ پروین نہایت انہماک کے ساتھ اس کام میں لگی رہیں۔ انھوں نے تلاش اور جستجو سے اختر انصاری کی تقریباً سبھی تحریریں فراہم کیں اور طالب علمانہ لگن کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا پھر ہر صنف ادب کے فنی اصولوں کی روشنی میں معروضیت کے ساتھ ان کا تنقیدی جائزہ لے کر اختر انصاری کے ادبی مرتبے کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ فاطمہ پروین ادب کا ستھرا ذوق رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ تنقید میں انھوں نے کسی ایک دبستان کی پیروی کرنے کے بجائے سبھی دبستانوں سے بقدر ضرورت استفادہ کیا ہے۔ دوسرے نقادوں کی آرا سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے ذوق ادب اور مطالعے پر بھروسہ کیا ہے۔

تنقید نگاری میں انھوں نے جس خود اعتمادی کا اظہار کیا ہے اس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ آئندہ چل کر ایک اچھی نقاد ثابت ہوں گی۔

مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے گا۔

مغنی تبسم

۲۶/۹/۱۹۷۹ء

ریڈر شعبۂ اُردو
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

اختر انصاری کا نظریۂ ادب

اختر انصاری کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے ابتدا میں وہ "ادب برائے ادب" کے نظریہ کے قائل تھے چنانچہ اپنے پہلے مجموعہ کلام نغمہ روح (۱۹۳۲) کے دیباچہ میں انہوں نے اس نظریہ کی کھلے لفظوں میں تائید کی ہے اور ادب کو خالص جمالیاتی اور فنی اصولوں کا تابع بتایا۔

"آرٹ تخلیق حسن ہے اور آرٹسٹ خلاق حسن آرٹ کو اصلاح کا ذریعہ بنانا اپنی کوششوں کو ضائع کرنا اور آرٹ کی روح کو فنا کرنا ہے آرٹ ماورائے اخلاق ہے ۔ فن وتخلیقی کارنامے ہماری اخلاقی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔ فنون لطیفہ تعیش وتنزل کی پیداوار ہیں ان کو جزو زندگی بنانا ضعف وانحطاط کو دعوت دینا ہے[1]"

آگے چل کر ان کے نظریہ ادب میں تبدیلی آگئی اور وہ ترقی پسند تحریک کے ہم نوا بن گئے ۔ ادب اور اس کی افادیت کے موضوع پر ان کی ایک مستقل کتاب "افادی ادب" کے نام سے سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی ۔ انہوں نے ایک ادبی ڈائری بھی لکھنی شروع کی تھی جس میں قدیم اور معاصر ادیبوں، شاعروں ان کی تصانیف کے بارے میں وقتاً فوقتاً اپنے خیالات اور تاثراتِ قلم بند کیا کرتے تھے یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک

۱۔ نغمہ روح ص ۱

جاری رہا بعد ازاں یہ ڈائری کتاب کی صورت میں شائع ہوئی اس کے علاوہ مختلف مضامین، دیباچوں وغیرہ میں بھی انھوں نے اپنے تنقیدی خیالات پیش کئے ہیں ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "مطالعہ و تنقید" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ادب کے بارے میں اپنے بدلے ہوئے خیالات کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "افادی ادب" میں کیا ہے کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ وہ ادب کی افادیت کے قائل ہیں اور ادب کی مقصدیت پر زور دیتے ہیں۔ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے آغاز کے کوئی پانچ برس بعد لکھی گئی۔ اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور ان کے قارئین کا ایک وسیع حلقہ اس تحریک سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس دوران ترقی پسند ادب کے بارے میں جو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں تھیں بڑی حد تک رفع ہو گئیں۔ ترقی پسند نقادوں نے اپنے نظریہ ادب کی وضاحت کے لئے متعدد مضامین لکھے اور معترضین و مخالفین کے جوابات دئیے۔ "افادی ادب" بھی دراصل اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں اختر انصاری نے اس تحریک کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے ادب کی ماہیئت اور افادیت کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں جیسا کہ پیش لفظ کی اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔

> "ہم افادی اور مقصدی ادب کے علم بردار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے، تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پہ اثر انداز بھی"[1]

1۔ افادی ادب ص ۸

کتاب کے آغاز میں انھوں نے "ادب برائے ادب" کے نظریہ پر تنقید کی ہے کہ

"ادب کے متعلق اس قسم کے خیالات و عقائد ... اس وقت زور پکڑتے ہیں جب ادب دولت کا محکوم اور سرمایہ کا غلام ہوتا ہے اور فن عوامی زندگی کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے" [۲]

آگے چل کر انھوں نے اُردو کے قدیم ادب اور شاعری کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ گذشتہ تین سو برس سے وہ

"ملک کی سیاسی و سماجی زندگی کے ساتھ کوئی حقیقی جاندار اور دیرپا رشتہ قائم نہ کر سکا" [۳]

اس کا سبب ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی کا انتشار تھا۔ اس نزاعی دور میں ادب و شعر پر "مریضانہ انفرادیت" مسلط رہی اور سماجی کمزوریاں ادب میں اظہار پانے لگیں۔

دوسرے باب میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ داخلی اور خالص جمالیاتی۔

"شاعری بھی خارجی حالات سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتی ہے لیکن ان کے خیال میں ادب اور اجتماعی زندگی میں یہ سرسری ربط و تعلق کافی نہیں ہے۔ ادیب کو چاہیئے کہ وہ بالا رادہ اپنے ادب

---

[۲] افادی ادب، ص ۱۴ - ۱۵

[۳] افادی ادب، ص ۱۵

کو خارجی حالات کا ترجمان بنائے"۔[۱]

"ادب برائے ادب" کے علم بردار ابدی قدروں کی بات کرتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ادب کو کسی خاص وقت اور مقام سے وابستہ نہیں ہونا چاہیئے۔
اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے اختر انصاری کہتے ہیں کہ

"ادب کا کوئی موضوع "ابدی" نہیں ہوتا۔ ہر موضوع "وقتی وہنگامی" ہوتا ہے۔ وہ چیز جو دراصل زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے اور ہو سکتی ہے تخلیقی ادب کا وہ کارنامہ ہے جو فن کے اعلیٰ جمالیاتی معیار پر پورا اترتا ہے"۔[۲]

اختر انصاری کے خیال میں ادب میں دوسری خصوصیت یہ پائی جانی چاہیئے کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔

وہ کہتے ہیں کہ "حسن آفرینی کا تعلق ادب کی ماہیت سے ہے اور حصول مسرت ادبی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ ماہیت اور نتیجے کو مقصد قرار دینا درست نہیں ہے"۔

ادب کے مقصد کو واضح کرنے کے لئے وہ محرکاتِ تخلیق کا جائزہ لیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

"ادب کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ادیب اس کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچائے اور دوسروں کو متاثر کرے یہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ ادیب کے خیالات سماجی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے نہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ادب کا مقصد

۱۔ افادی ادب، ص ۴۴

۲۔ افادی ادب، ص ۵۷-۵۸

سماجی زندگی کو متاثر کرنا ہوا۔" [1]

اس کے آگے وہ سماجی مقصدیت کی تشریح کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ

"جب تک سماج مختلف اور متصادم طبقوں میں بٹی ہوئی ہے ادب میں طبقاتی رنگ اور طبقاتی نزاع کا جھلکنا ناگزیر ہے۔ طبقاتی سماج کا ادب طبقاتی ہوگا۔" [2]

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"طبقاتی سماج میں کسی ادیب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے اور کسی نہ کسی طبقے کی حمایت نہ کرے۔ لیکن کوشش اور ارادے کے بغیر ادب میں ایک رجحان کا پیدا ہو جانا اور بات ہے اور شعوری کوشش سے ادبی تخلیق کو کسی مقصد کے تابع کرنا اور بات ہے۔" [3]

ادب کے مقصد کو اس طرح متعین کرنے کے بعد وہ کسی ادبی کارنامے کو جانچنے اور اس کی قدر و قیمت کو متعین کرنے کا ایک پیمانہ پیش کرتے ہیں جس کے مطابق کسی ادبی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ

"اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہے یا نہیں۔" [4]

---

[1] افادی ادب، ص ۴۶

[2] افادی ادب، ص ۷۲-۷۳

[3] افادی ادب، ص ۷۶

[4] افادی ادب، ص ۷۹

اس کے بعد وہ ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لے کر اس سماجی مقصد کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جو ان کے خیال میں آج کل کے ادیبوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

"ہماری موجودہ سماج دو بڑے گروہ یا دو بڑے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے! اب ادیب کو یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ ان دونوں طبقوں میں سے کس کی حمایت کا کام اپنے ذمہ لے ... وہ یا تو رجعت پسندوں کا ساتھ دے سکتا ہے یا اپنی اور اپنے ادب کی قسمت کو ان مظلوموں کے مقدر کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہے جو ترقی پسند اور انقلاب پرست ہیں... کوئی تیسرا راستہ اس کے سامنے نہیں ہے" ؎۱

اس خیال کو انھوں نے کسی قدر وضاحت کے ساتھ اپنے ایک مضمون "ادب اور سیاست" میں پیش کیا ہے:

"ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کر سکا ہے۔ جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیم ایک صاحبِ اقتدار بالائی طبقے کی ملکیت تھی اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے۔ ادب اور سیاست کا تعلق بھی سرسری سطحی اور معمولی تھا۔ پھر جب عوام میں سماجی احساس بڑھا اور اور سیاسی شعور پیدا ہوا اور خود سیاسی مسائل زیادہ اہم اور وزنی ہو گئے تو ادیب اور سیاست کا تعلق بھی گہرا اور

؎۱ افادی ادب ص ۸۲

جاندار ہو گیا اور آج کا ادیب اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا ادب سیاست کے تقاضوں کو کس طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس پر مجبور ہے کہ اپنے ادب میں سیاسی حقائق کے لئے جگہ پیدا کرے۔ صرف یہی نہیں وہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ سیاست اور اس کے ادب کا یہ باہمی تعلق محض اتفاقی نہ ہو، بلکہ اس کی شعوری اور دانستہ کوشش کا نتیجہ ہو۔ یہ شعوری اور دانستہ کوشش ہی وہ چیز ہے جو اس کے ادب کو صحیح معنوں میں زندگی کی تفسیر اور تنقید بنا سکتی ہے۔" ۱؎

ان کے خیال میں:

"صرف انقلابی ادب ہی موجودہ زمانے کا حقیقی ادب ہو سکتا ہے۔" ۲؎

انقلاب کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"انقلاب معیاروں اور قدروں کی اس تبدیلی کا نام ہے جو ایک تاریخی ضرورت اور جدلیاتی مطالبے کی حیثیت رکھتی ہے آج کل کے سیاسی و سماجی حالات میں انقلاب عبارت ہے اس تبدیلی سے جو سرمایہ داری کا (اور اس کے ساتھ جاگیرداری کے باقیات کا) خاتمہ کر دے۔" ۳؎

۱؎ مطالعہ و تنقید، ص ۱۶ | ۲؎ افادی ادب، ص ۸۵

۳؎ افادی ادب، ص ۸۶

انقلاب کی تعریف کے بعد وہ انقلابی ادب کی وضاحت کرتے ہیں۔

"انقلابی ادب وہ ادب ہے جو سماج کی بناوٹ کو تنقید کا نشانہ بنائے اور اس میں اساسی تبدیلیاں پیدا کرنے کی ضرورت کو محسوس کرے .... انقلابی ادب پرولتاری اور عوامی نقطۂ نظر سے زندگی کی تفسیر و تنقید کا نام ہے" ۱

ادب کی مقصدیت پر اس قدر زور دینے کے باوجود اختر انصاری نے اس کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو مقصدی ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے۔ وہ سچے ادب کی طرح جذباتی، جمالی اور تخیلی تجربات کا اظہار ہو۔ یعنی خارجی حقیقتوں کی بے جان عکاسی اور عقلی یا فلسفیانہ عقیدوں کی بے روح تشریح و توضیح کے بجائے ان حقیقتوں اور عقیدوں کے جذباتی و وجدانی تصور کو صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرے" ۲

اپنے اس نظریے کی بنا پر انھوں نے اس دور کے ایسے ترقی پسند ادب کو بھی اپنی تنقید کا ہدف بنایا جن میں صناعی محاسن کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ ان کے خیال میں:

"اگر بعض ترقی پسند مصنفین کی تحریریں اعلیٰ فن کارانہ محاسن

---

۱ افادی ادب، ص ۸۶ و ۸۷

۲ افادی ادب، ص ۹۴

سے محروم ہیں ـــــ اگر ان میں واعظانہ، خطیبانہ اور ناصحانہ
انداز غالب ہے، چیخ و پکار اور نعرہ زنی کی زیادتی ہے
تبلیغ اور تلقین کا پہلو نمایاں ہے جذبات کو متاثر کرنے
والی خصوصیت کا فقدان ہے تو قصور مقصدی ادب کا
نہیں بلکہ ان ادیبوں کا ہے جنھوں نے صناعی محاسن کو
نظرانداز کیا!" [1]

اس طرح ہم نے دیکھا کہ اختر انصاری ابتدا میں ادب برائے ادب کے حامی تھے اور ان کی حمایت انتہا پسندی کے حد تک پہنچ گئی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے ادب برائے زندگی کے نظریئے کو سختی کے ساتھ اپنایا لیکن ساتھ ہی ساتھ ادب کی صناعت اور حسن کو نظرانداز نہیں کیا۔ اپنی ادبی ڈائری میں بھی انھوں نے اپنے متوازن موقف کی جا بجا وضاحت کی ہے۔ یہ موقف قریب قریب وہی ہے جس کا اظہار عندلیب شادانی نے اختر انصاری کے موسومہ ایک خط میں کیا ہے اور جسے اختر انصاری نے کسی تبصرے کے بغیر ۱۲، اپریل ۱۹۴۲ء کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔ اس خط کا یہ پہلا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میں بیک ـــــ وقت دونوں کا (ادب برائے ادب اور
ادب برائے زندگی) کا قائل ہوں۔ انسان جو کچھ لکھتا
ہے اپنے میلانات اور رجحانات کے ماتحت لکھتا ہے ـــــ
فرق صرف آمد اور آورد کا ہے ــــــــــ اصل چیز

---

[1] افادی ادب، ص ۹۳ ـ ۹۴

یہہ ہے کہ لکھنے والا کامل الفن ہو اور جو کچھ لکھے صداقت۔ بے ساختہ لکھے "[1]

---

[1] ایک ادبی ڈائری ، ص ۲۹۱ ، ۲۹۲

اختر انصاری کی شاعری کے ادوار

دور اول

(۱۹۲۲ ــــ ۱۹۴۳)

۱۹۲۸ نظمیں ــ سیر کہار ــ آب رواں ــ قطب مینار

۱۹۲۹ نظمیں ــ دل کی دنیا ــ ہلال عید ــ خود اپنا راہبر ہو بن کر غبار منزل ۔ اجسادِ بے حِس میں روح شرار ہو جا

وہ بھی کوئی شرر ہے جو سنگ میں چھپا ہو

غزل ــ چیر کر سینے کو رکھ دے گر نہ پائے غمگسار

فضا میں نالہ کناں ہے مغنیہ کی صدا

۱۹۳۰ نظمیں ــ عالم اضطراب میں ــ آمدِ بہار ــ نغمۂ شام ــ برسات کے مناظر ــ غم محبت ــ شام ــ

غزلیں ــ جو داغ بن کے تمنا تمام ہو جائے ۔

حیات انسان کی سرتاپا زبان معلوم ہوتی ہے

قطعات ــ مرے حواس پہ اک بے خودی سی چھائی ہے

بھری ہے قہر کی مستی ہوا کے جھونکوں میں

۱۹۲۱ نظمیں پرتگال ـــ مغنیہ سے ـــ امنگ

غزلیں زمانے بھر سے کہہ دیتی ہیں دل کی داستاں آنکھیں

آرزو کو روح میں غم بن کے رہنا آگیا

شبِ مہتاب میں فطرت حسین معلوم ہوتی ہے

قطعات ضیاءِ فگن ہے قمر موجِ آب زمزمہ بیز

شراب ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شئے آج

یعنی سنتا ہوں کہ دل مرکزِ رعنائی ہے۔

سکوتِ شب میں فضا، چشمہ زار نغمۂ رنگین

کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے

جو نقش ہے اثرِ خامۂ محبت ہے

ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی تھی اور دریا تھا

۱۹۲۲ نظمیں مغنیہ ، بسنت ، اودے شنکر

غزل دن مرادوں کے عیش کی راتیں

قطعات یعنی پہلو سے میرے وہ دلِ دیوانہ گیا

الم نے چھین لیئے ہائے وہ خوشی کے دن

کس قدر آن بان کی راتیں

لیکن اللہ ! بات یہ کیا ہے ؟

خون بھرے جام انڈیلتا ہوں میں

ہلکے ہلکے سرد جھونکوں کی لہک

بجلی کی طرح کوندرہی ہے صدائے تیشہ

سازکے تاروں کو جب کرتی ہیں مس

اک چمن جس میں گل نہیں کھلتے

کاش میں جامِ شعر بھر سکتا !

ہر چند نامرادِ محبت ہے بے زباں

پھوارِ ابر ، پرندوں کے گیت ، مست ہوا

نسیم ، پھولوں کی رونق ، کھلے ہوئے تارے

ہمیشہ وقت سحر جب قریب ہوتا ہے

صدائے ساز بہ رنگِ فغاں نکلتی ہے

تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں رات سو نہ سکا

جب اک دکھ بھری اور پُر درد آہ

ہائے کیا کیا کلی کھلا کے ہنستے ہیں

اب وہ سینہ ہے مزارِ آرزو

سمجھتا ہوں میں سب کچھ صرف سمجھانا نہیں آتا ۔

۱۹۳۳ غزلیں طبعِ عشرت پسند رکھتا ہوں

اب وہ سینہ ہے مزارِ آرزو

غم زدہ ہیں ، مبتلائے درد ہیں ، ناشاد ہیں

اپنی اجڑی ہوئی دنیا کی کہانی ہوں میں

اب وہ سینہ ہے مزارِ آرزو

سرشار ہوں چھلکتے ہوئے جام کی قسم

میرے رخ سے سکوں ٹپکتا ہے

سننے والے! فسانہ تیرا ہے
کیا خبر تھی اک بلائے ناگہانی آئے گی
آفتوں میں گھر گیا ہوں زیست سے بیزار ہوں
دہن میں زہر ہے قند و نبات کے بدلے
پھول سونگھے جاتے کیا یاد آگیا ۔
دل کے شکستہ ساز سے نغمے ابل پڑے
غم حیات کہانی ہے قصہ خواں ہوں میں
میری جبیں سے یہہ سچ ہے سکون ٹپکتا تھا

قطعات
طرب افزا سُروں میں گاتی ہے
درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے
دفعتہً سورج جو بے پردہ ہوا
وہ مسرت جواب نصیب نہیں
یہ شیریں راگ میرے حافظے کو جگمگاتا ہے
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
اے کہ تو گم ہے مست تانوں میں
اپنی آواز کو اٹھاتی ہے ۔
پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھوار
اور نغمہ ہے روح افزا حسن
اس طرح سے امید آتی ہے
عالم وجود میں ہے روح بری

یہ طرب، یہ نشاط اور یہ نوچ
دھیمی آواز دکھ بھرا لہجہ!

۱۹۲۴	نظمیں	فردوس خیال، محبت سے پہلے، شب بہار، چاندنی رات میں
	غزلیں	دل کے ارمان دل کو چھوڑ گئے۔
		ہر وقت نوحہ خوان سی رہتی ہیں میری آنکھیں
		خواہش عیش نہیں در زندانی کی قسم
		ہم اپنے نالۂ سوزاں سے پھونک دیتے قفس
	قطعہ	گو درد کی کسک سے میرا دل ہے بے قرار

۱۹۲۵	غزلیں	صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
		میں دل کو چیر کے رکھ دوں یہ ایک صورت ہے
		کوئی باتوں باتوں میں "باوفا" جو کہہ گیا
		جینے کی جد و جہد میں جی سے گذر گئے
		محبت کرنے والوں کے بہار افزا دل سینوں میں
		دلِ فسردہ میں کچھ سوز و ساز باقی ہے
		محبت ہے، اذیت ہے، ہجوم یاس و حسرت ہے
		اس تصورِ پُر کیف پہ فدا ہوں میں
		بے خودی کی شراب پیتا ہوں
	قطعات	فضا ہے مست، زمانہ اسیرِ غفلت ہے
		آب دریا میں ہے جس طرح روانی پنہاں۔

کبھی ہنسا ، کبھی آہیں بھریں ، کبھی رویا
بس یہ محسوس کر رہا ہوں میں
اپنی آہ و فغاں کو ڈھالا ہے
جہاں دیدنی ہے لہو کی روانی
رات کا وقت ہو گھٹائیں ہوں
نہ دِل ہے نہ ہنگامہ آرائیاں ہیں

۱۹۲۶ غزلیں ہائے دو بستیاں اُجڑتی ہیں
دکھ محبت میں وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
بہار آئی زمانہ ہوا خراباتی
کہاں لے جاؤں میں ناشاد اس آزارِ پنہاں کو
قطعات بہتے دریا کی روانی بند کر سکتے نہیں
دل ہے فردوس کی بہاروں میں
کوئی گاتا ہے ہم روتے ہیں اختر
چاندنی ، حسن ، شعر اور گانے
پھول تجھ پر نثار ہیں سارے
تہہ و بالا ہے زندگی کا نظام
اب نہیں درد تمہارے دل میں
فضا رہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت

۱۹۲۷ نظمیں منصف ، بُت تراش ، ڈھولک کا گیت ، دیوداسی

فطرت شباب، تم اور ہم، ایک ماہ پارہ، دوپہر
جوان مرگ شاعر، پیدائش شعر، خواب، گائے جا، شاعر
کی دنیا۔

غزلیں سرمستیوں میں روحِ جوانی پگھل گئی
کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں
وہ دن بھی تھے کہ میں آلودہ شراب نہ تھا
ہے امنگ اجڑے ہوئے دل میں بھری کیا کہنا

۱۹۲۷ قطعات ہوا کے جھونکے مرے واسطے نئے ہیں آج
ہے اک ایسی مئے نشاطِ رنگین
ہوں اک آزاد تر مغنّی میں
اب کہاں ہوں، کہاں نہیں ہوں میں
ہائے کس قہر کی حسین ہے رات
ہائے کیا قہر تھی وہ پہلی نظر!
جا رہا تھا میں سر جھکائے ہوئے
گیت کے ہاتھوں لٹا جاتا ہوں میں
آپ اپنے سے چھینا جاتا ہوں میں
کشتیِ امید ہوں کھینا مجھے
غمِ حیات کو غرقِ شراب کرنے دے
جی کو ناحق نڈھال کہتے ہو
جیسے پینے میں نشہ چڑھتا ہے

غمزۂ حسن ہے کیا عشق کی گھاتیں کیا ہیں
کیجئے کیا اگر نہ چپ رہیئے
شمعِ انسانیت کی لَو ہیں ہم
حیف! کیا مبتذل نوائی ہے
زندگی کی اندھیری رات ہے یہ
گلشنِ جہل کی بہاریں ہیں

۱۹۳۸ غزل آرزو سے بھرا ہوا ہوں میں
قطعات گوشۂ باغ کی ملاقاتیں!
یہ ملاقات لوٹے لیتی ہے
میں نے دیکھا تو اشک بہنے لگے
اگر سفینہ ہو نازک تو یونہی کہتے ہیں
محبت آہیں بھرتی ہے تمنائیں ترستی ہیں
ہوا مخمور ہے بادل غزلیت رنگ و مستی ہیں
یہ دل کے ہے حسن و عشق کا سونا
چاند پگھلی ہوئی سرد آگ سی برساتا ہے

۱۹۳۹ قطعات نوا میری نوائے جادُودانی
تمام عمر یہ صدمہ رہے گا میرے ساتھ
میرا طرزِ سخن نرالا ہے
خریدلیں میری راتیں غمِ تمنّا نے

سوزِ حسرت بھرا ہے آہوں میں
ربابِ جوانی کی لرزش تھی وہ

لہو کھیلتا ہے تمنا سے پھاگ
مرا شگوفۂ اُمید کیوں نہیں کھلتا

ہلائے کیا ہے کسی کی گھڑیاں تھیں
جیسے شعلوں سے کوئی کھیلے پھاگ

فضائے چرخ سے تاریکیاں برستی ہیں
صدا ہوں شکستِ تمنا کی میں

ذوقِ ناکامی فسانہ ہو گیا

۱۹۳۹ قطعات

وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی
کسی کو تمناؤں کا آسرا ہے

ہو کے بے فکر تان اُڑائے جا
دل تو روئے مگر میں گائے جاؤں

اجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو
صبح کا دش ہے شام کا دش ہے

دشمن ایسا ستم نصیب نہ ہو
دل ابھی تک ہے آرزو آباد

اس نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
مرے دل میں حسرت ہی حسرت بھری ہے

حسن کی داستاں بنا ڈالا
غم زدہ دل کا کوئی خدا بھی ہے

یہ ساغرِ غم کی گردش ہے صہبائے طرب کا دور ہے یہ

رخِ رنگیں پہ پڑ گئیں نظریں

میں صدمۂ یاس اٹھا چکا ہوں

ہر طرف ایک بے حجابی ہے

میں کروں دل کو پھر حسرت سے پامال

ہوائیں خنک چاندنی پرسکوں

صبح کی تنویر بن کے آئی وہ نازک خرام

برق گرتی ہے مسکرانے میں

ملنے جلنے کی بند ہیں راہیں

کب تک میں یہ آفتیں سہوں گا؟

ایک بھولی ہوئی سے یادِ حزیں

یا فضا ر بھر رہی ہے سرد آہیں ؟

۱۹۲۹ قطعات جس کا ہر دم خیال آتا ہے

آہ! کس خورشید کا مارا ہوں میں ؟

موت کی سی پرسکون ویرانیاں

دل کو برباد کئے جاتی ہے

اور ماضی میں زندگی بھر دی

نشے میں چور جہاں کی ہر شئے

بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر

اندھیری رات تھی تاریکیوں کی بارش تھی

یہ روداد نہیں لطفِ زندگانی کی

ذوقِ حسن اس درجہ
خزاں نصیب بھی ہوں رونقِ بہار بھی ہوں
سارا جہاں ہے چاندکی کرنوں سے سیم گوں
پاس کا خارزار بھی دیکھو

۱۹۴۰ تیلوت کیف صہبائے ارغوانی کی
دیکھتا آسمان کے تاروں کا
اس کے رنگوں میں میرے حال کی تفسیر نہیں
آہ ! اے صبح و شام کو سری ؟
چاندنی کا جمال پاکیزہ
ندی خواہش کی چڑھتی جاتی ہے
خلش میں درد میں تکلیف میں راحت سی ملتی ہے
یہ بار الم اٹھایا نہیں جاتا
دئے کیا کیا نہ غم خوشی نے مجھے
نغموں سے کبھی تھا کام ہمیں اب آہوں میں جی کو کھوتے ہیں
سلسلہ دیر تک وہ باتوں کا
جیسے ٹھنڈی ہوا پہاڑوں کی
میں اس وقت گویا زمیں پر نہیں ہوں
جیسے پھواریں لطیف اور ہلکی
کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شئے ہے گویا
یہ سماں عکس ہے فردوس کے گلزاروں کا

اس کی گردن ہے اور میری باہیں

دل ہے بیمار اب نہ روح علیل

ایک ایسا بھی وقت آیا ہے

افسردگی چھپی ہے تیری شگفتگی میں

گردن میں پڑی ہیں غم کی باہیں

پڑ رہی ہے یا گلستاں میں پھوار ؟

یہی طغیانیِ غم زندگی معلوم ہوتی ہے

کلیوں کی چٹک گل کی ہنسی چاندنی کا ساز

جس طرح چاند گھٹاؤں میں چھپا ہوتا ہے

اس طرح چھیڑتے ہیں اے اختر

ہر طرف ہے جلوۂ مہ پاش پاش

کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا

عمر بھر اک ہار میں گوندھا کیا

۱۹۴۱ غزلیں رباب زیست کے تاروں میں زیر و بم نہ رہا

اب کوئی دم میں غرق ہوا چاہتا ہوں

ہو کے برباد غم عشق میں جتنا ہوگا

ہم درد چاہتے ہیں گو درد کے ہیں مارے

محبت کی سوزش سے خالی ہے سینہ

قہر ہے اس جہاں کا یہ دستور

شب تار تیری خموشی کے قربان بتا آمد آمد ہے کس رشک مہ کی

تھی امیدوں کی وہ دولت بھی میرے پاس اک دن
راگنی دل کی بہت گائی گئی ہے پہلے
عالم یہ ہے شباب میں جوشِ شباب کا
اگر دل کا نہ مجھ پر قہر ہوتا
ہے یاس میں نمایاں امید کی جھلک بھی
یوں تو جیئے ساری عمر لیکن
زندگی اک حسین دھوکا ہے
حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلم کی
نغمہ اس طرح میرے دل پہ اثر کرتا ہے
نگاہِ شوق کی عادت ہے کہ اک اک سے کہے
فلک سے رات کو جب چاندنی برسائی جاتی ہے
میرے حواس پہ ایک بے خودی سی طاری ہے

۱۹۴۲	نظمیں	تم اور ہم ، جواں مرگ شاعر

۱۹۴۳	نظمیں	ایک ماہ پارہ ، دوپہر
	قطعہ	ہے نغمہ سرا نغمۂ رسیم رنگ
	نظمیں	ہنگامۂ خیال ، لمحات یاس ،
	غزلیں	دہر سے بے خبر رہا ہوں میں
		نظر ملانی ہے دشوار دل دھڑکتا ہے
		پردہ اٹھتا دکھائی دیتا ہے

صدقے جاؤں بہارِ ساون کے
جب اشک آنکھوں سے رخسار پہ ڈھلکتا ہے
میں نے جب تنگ آ کے نالہ کیا
ہے نذرِ دل قبول نگاہ کامیاب ہے
دخترِ رز ذرا نہیں بھاتی
اصل مقصد ہمیں ستاتا ہے
غم دلِ عیشِ جاودانی ہے
غمِ زمانہ بھی ہوں عشرت جہاں بھی ہوں
میں ہوں مایوس کوئی بتلاؤ
خیال کے گلستاں میں جانِ حزیں کو جھولا جھلا رہا ہوں
قسم ان آنکھوں کی جن سے لہو ٹپکتا ہے
مذاقِ آرزو کی آفتیں دن رات سہتا ہوں
مصور بن کے بیٹھے ہیں شاعر بن کے بیٹھے ہیں
کیسے بدلوں میں اپنی فطرت کو
نہیں مایوس انجام سے میں
عشق کرتے تھے گل عذاروں سے
حسن کو بے نقاب دیکھا ہے
رنگ تصویرِ خیالی میں بھرا کرتا ہوں
مرا ہر ساز ہے سازِ محبت
دکھ سے ہو جائے یہ جہاں خالی

ملالِ بے اثر اور گریہِ ناکام ملتا ہے
ہو گیا ہوں میں حال سے بے حال
کیا بتاؤں میں کیا ہے من کی آگ
اگر دل کا نہ مجھ پہ قہر ہوتا
نشانِ انسانیت کے نشایا ہوں
تو جو راتوں کو اٹھ کے روتا ہے

قطعات

نغمہ گر سے اگر یہ کہہ دوں میں
گرمیٔ عشق ہو گئی تاراج
ڈبڈبا آتے ہیں آنسو آنکھ میں
ہو گیا ہوں خود بخود سرشار سا
"تیری غم کوشاں قیامت ہیں"
دل کشا دن ہیں جاں فزا راتیں
پڑ رہی ہے پُھوار ہلکی سی
فرصت ہے کوئی فکر نہیں کنجِ باغ ہے
نظارۂ حسین ہے نگاہوں کے سامنے
آتشِ غم بھڑک رہی ہے آج
غم ہے اور میری ہستی
کہ سحر ہوتے ہی ہمسائے تعجب سے کہیں
بزمِ شب کی گرمیوں کا کچھ نشہ باقی نہیں
کیوں نہ صدقے جائیں اس سحر کار آواز کے
صورت و قیمت کوئی نہیں ہے
آئینہ دار ہے دلِ خانہ خراب کا

اُردو کی جیسے کوئی غزل سن رہا ہوں میں

جو چھپا ہے آنکھوں کے پردوں میں پہلے

ہاں جنونِ عشق کی سوتیں ابلتی تھیں یہیں

اس وقت مجھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ نشیلی کیفیتیں

دورِ دوّم

(۱۹۴۴ — ۱۹۵۹)

۱۹۴۴ نظمیں اس بار ہمیں جانا سوھن ور یہ لوگ خاشرم، ہمارا خون، ایک ستارہ کلکتہ، ہماری بلا سے، آج کے شاعر کا گیت، کون طیارہ پردیسی اجنبی، ستم کی خدائی، جبرِ حیات، یہ جہاں، مصنف، آج سے ہم بھی اپنے نہیں، رودادِ فکر و عمل

غزلیں مطربِ دل کی وہ تانیں کیا ہوئیں

کس سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں

یہ حسین فطرت کے حسن کا البیلا پن

آرزو کے جنونِ خام کی آگ

محبت کے غموں سے کب تک نبھائیں

بہت ہوا مجھ سے ترنم کے طلب گار نہ ہو

قطعات زمیں کی سطح سے تھے ہم بہت بعید و بلند

مدت ہوئی کہ نغمہ فشاں بھی ہوئے تھے ہم

شمع افسردہ ہے قندیل فلک

کیسی ہیں یہ کاندھے پہ کفنائی ہوئی لاشیں

شعاعوں نے بارش نے شبنم نے بے شک

۱۹۴۷	نظمیں	طلوعِ آزادی، فسادات، مادرِ وطن سے

۱۹۵۲	غزلیں	مہربان مارے گئے؛ نا مہربان مارے گئے
		بہارِ فکر کے جلوے لٹا دیئے ہم نے
		جل گیا کربِ تمنا کا فسوں مارے گئے
		حیات دل کے لہو سے رچائی جاتی ہے
		خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں
	قطعہ	برق کا کوندا اسے کہئے اسے رقصِ شرار

۱۹۵۳	نظمیں	لی منگیشکر، گوتم بدھ اور کارل مارکس

۱۹۵۴	نظم	کس نے
	غزلیں	نصیب آج تک ایسی کوئی خوشی نہ ہوئی
		حواس و ہوش کی دنیا سے بے گانہ بنا ڈالا
		دفورِ شوق کی بنیاد آرزو تیری
		ہتیلیوں سے ابھی آنکھیں مل رہی ہے سحر
		دلِ حزیں کا ہے بے حد حسیں ہمارا درد
		صدا کچھ ایسی میرے گوشِ دل میں آتی ہے
		حیات کے کسی منظر سے سرسری نہ گذر

لطف لے لے کے پیئے ہیں تدرح غم کیا کیا

قطعہ وہ بے کسی ہے کہ اکثر عدو بھی روئے ہیں

۱۹۵۵ غزلیں وہ کرب جس کو یہ سمجھے تھے ہم کہ ذاتی ہے

نہ یہ کہ فقہ شعاری یہ حرف آتا ہے

قطعات گداز عشق کو پہلو میں ہوں بسائے ہوئے

ترے قربان بخت خفتہ! قوت بیدار ہوں

متزاد اس غم پہ جس کا نازپروردہ ہوں میں

جنونِ عشق کو بھی گردش جہاں کو بھی

حشر تک تیرہی رہے گی اس میں تو معذور ہے

ہوں ماورائے کون و مکان یا مکیں ہوں میں

کاغذی ناؤ ترانے کی ضرورت کیا تھی ؟

زہرہ وش ، مہ جبین رقاصہ

جیسے دوش ہوا پہ طیارہ

ناچ لیتی ہے آپ بھی خاصہ

غم حیات بہ قدر خزانہ قارون

۱۹۵۶ نظم سہاروں کی تلاش

قطعات یہ رہیں خروش سیارہ

مکیں ہیں اس کے بہت جبر و قہر کے مارے

جیسے پُرشوق دشتر کوئی دھارا

رامشِ گرِ تخلیق کی وہ زیست سرائی
کوئی کونپل زمیں سے پھوٹتی ہو
بامِ افلاک کو بے مشل سجایا تو نے
بُرے اعمال بھی لاریب ہوئے درجِ کتاب
خالقِ دوزخِ جہاں! امن دے تو
اندھیری رات میں نورِ شبِ مہتاب دیکھا تھا
جتنے قلزم بھی اٹھالاتے ہیں بادل اپنے ساتھ
اور گناہوں کی سزا کا بھی ہے اس دل کو یقین
حرفِ کن سے جو یہ ایک شور مچایا تو نے
میرا احساس غریقِ طرب جام و سبو
احساب دمکر و کیف دکھو حال وقال کا
روند ڈالا رخ دنیائے حسین کو تو نے
نسیم باغ کی فرحت کہاں سے لائے تم
ہمارے جام میں صہبائے آرزو نہ ڈھلی
تمام عمر رہے جو رہیں حسرت سے

۱۹۵۷	نظم	ایملی ڈکنس
	غزل	لذت کام اور تیز کرو
	قطعات	کلاہِ جورِ فلک کی مروڑ سکتے ہیں!
		انبساط حادِ دہر میں لطف ناؤ نوش میں
		فکر کے قہر و غضب نے مارا

رہین سوزِ جہنم گلِ بہشت یہ کیا
ازل سے دیدۂ نم ناک صرفِ گریہ ہے !
طلسمِ گلشنِ ایجاد بھول ہے کس کی
اک شورِ بے اماں کہ ترانہ کہیں جسے
جنوں میں اور مدن شہر کے تقاضوں میں
مدفنِ تحقیقِ رازِ ابتدا ہے یہ جہاں !
دردِ آگہیں نا کسی کی بات ہے کچھ اور ہے
خیال نبضِ جنوں کی طرح پھڑکتا ہے
کچھ اس طرح ہے جوشِ تغیر تھما ہوا
وہ پیاری راتیں نہ لوٹیں وہ پیارے دن نہ پھرے
جو ہو سکے تو مصائب کی تیرگی کو بھگا
ہائے یہ حال دل اپنا کہ سکون ہے نہ خروش
یہ جادۂ فنا یہ میرے خون چکاں قدم
یہ جہاں خود ہی خدا ہے کہ خدا کی ہے شبیہ
یہ دعا ہے کہ وہ ورثے میں مرا ذہن نہ پائے
جس راستے پہ چل رہے ہیں اس پہ چل کے دیکھ
شاعرِ دردِ محبت ہوں میں یزال نہیں !
سرورِ تلخی دوشینہ کے امانت دار !
ہر شب ہے نشے میں مرا ہر روز نشے میں
فلک پہ جیسے ستاروں کی گوہریں جنبش
تغیرات جہاں کا سروں پہ سایہ ہے

پرانے اور نئے کو سمونے والا وقت!
گردن پہ تھا ازل سے جو تقدیر کا جوا
وہ روح ناز جو خوابیدۂ خیال رہی!
دلِ خراب ہے اب تک اسیرِ بہجتِ غم
حوادثات کی بھٹی میں بھی جلے ہیں ہم
ندائے منزلِ بے جادہ ہیں خدا رکھے
اپنی عمر گذشتہ کے سائے
جگمگاتا ہی رہا جذب و جنوں کا سر پہ تاج
حیف! اک اوندھا پیالہ چرخِ نیلی فام ہے
گردشِ گردونِ گرداں آ چکی ہو جس کو راس
جنون شوق نہ زنہار بے عمل ہو گا۔
افلاک کی گردش ہے اک افسانۂ بے رنگ

۱۹۵۰ غزل

یہ صنم روایت و نقل کے ہیں وضاحت سے کم نہیں
ٹوٹتے ہیں فلک شوق سے تارے گویا
اس میں ارمان دفن ہیں اس میں امنگیں دفن ہیں
راندۂ ملک آئین میں ہیں ہم بھی
جیسے سب آسمان کے نام سے موسوم کرتے ہیں
ہم زمزمے نشاطِ جنوں کے نہ گا سکے
عوضِ ملک، اطاعت ہمیں منظور نہیں
محفلِ شوق رچانے میں تامل نہ کرو

اسی نے مسخ کیا آدمی کی فطرت کو
خرد کے مصلحت افروز سائے میں نہ پلے
ہائے وہ جس کے تصور سے رنگ جاں پر خروش
مرے سخن! نہ غنیں ہو وہ وقت آسے گا
رہیں جلوسے عالم مرا سوزِ جگر باقی !
اپنے ناسوروں میں یوں نشتر چھبونا چھوڑ دے
آہ میرے زخمِ دل برسوں لہو ٹپکائیں گے
پھر کہاں خوسے جنوں کرنے کے دن !
جیسے ویرانہ سائیں سائیں کرے
کون ہے ہم میں جو صانع نہیں فن کار نہیں
افلاک سے بنی نہ زمینوں ہی سے پٹی
یا موسم بہار کی گاتی ہوئی سحر
دردِ حسرت کی دل نشینی دیکھ
جب ابتدا ہی میں یہ حال تھا مقدر سے
جہاں میں کب کوئی مجھ سا خراب آیا تھا
ادھر دماغ میں ساکت دلوں کو سکتہ ہے
وجہ نازِ اپنی الم خوردہ ہنسی کیا کم ہے !
اب بھی ہیں بہت آفریں غم کی تباہ کاریاں
فغانِ غم سرودِ انجمن معلوم ہوتی ہے
عمر بھر جینے کی تہمت بھی اٹھے گی یا رب !
بربطِ ضبطِ فغاں کی زمزمہ باری تو دیکھ !

کہ تیرے وار سے کوئی نہ زینہار بچا
بہت سے عشرتِ نوروز و عید میں ہیں مگن
آہ! مرگِ آرزو کا ماجرا اب کیا کہوں !

۱۹۷۹ غزل پُر کیف ضیائیں ہوتی ہیں پُر نور اُجالے ہوتے ہیں
قطعات پہنائے آسمان پہ ہیں طاری اداسیاں !
سازِ غم کے تار جلتے ہی رہے
وفورِ رحمت وارفتہ سمیٹ سکتا ہوں
بسعیِ نوروز میری عید نہیں ہو سکتی
نچوڑ ہے وہ تپش کی اُبلتی ندیوں کا
ہو سکے جس درجہ تخمِ اشک خونیں بو لیجئے
جو نہاں سعیِ انبساط میں ہے
اب بھی صورت ہے وہ بھی جینے کی
پلٹ کر آنکھ سے ظالم اُتر آتا ہے سینے میں
مرا ہوں گا تو چھوٹ جائیں گے
لکھ دے بے شک عدو کی قسمت میں
شاید اس کے سوا کچھ اور نہ ہو
امیدِ شوق سے وعدے وعید ہوتے رہے
نفس نفس ہے گراں بارِ آرزو اب تک
یہ گلستانِ تصور کی وجد بار نسیم !
نغمے دن رات یونہی برسیں گے

خوب غم کا اثر کیا ہم نے
رگ جاں میں سموئے بیٹھے ہیں

پاتے نہیں ہیں فیض جہاں سے ہم !
جوشِ نشاط سے چہک اٹھا دلِ ملول

یہ احتراز ہے غم کی ہزاروں راتوں کا !
کہ سن لے اے جہاں کے خالق ! تو

اگرچہ ماہ جبیں ہے یہ آسمان بدبخت
ترا ڈھنگ ہے کتنا عجیب اور نیارا

میں بھی سراپا شکر و خرابی !
زندگانی لبِ انفاس پہ اک نالہ ہے !

کیف و سرور و بہجت و مستی کی خیر ہو !
سوزِ جگر میں سوزِ قیامت کی آن بان !

غزلیں میرے دل میں پائی جگہ رہ گیا
ذرا وقفیت تجھے کاش ہوتی

فلک کی رفعتوں پر رہنے والو !
نہ اپنوں کے طعنے نہ دشنام اغیار

ذرۂ خاک کو اخگر نہ کہو
اس طرح چھیڑتے ہیں اختر

یہ زہرِ ہلاہل بہت پی چکا میں
ہوگئیں دل کی حسرتیں برباد

سینہ خالی روح ویراں دل تباہ

قطعات

ہے کوئی مست بادۂ گل گوں
تمناؤں کا ہو گیا خون آہ

اب نہ اگلی سی وہ طبیعت ہے
جانِ تمنا مرا قلبِ پُر خون

آنسو میں ہے خون کی سرخی
منہ محبت نے دل سے موڑ لیا

یہ رات اور یہ شعلہ فشانیاں تیری !
اب نہیں ہے جنونِ نغمہ و ساز

قصۂ "زہرِ عشق" کہنا ہے
جاگتا رہا ہوں نیند آتی نہیں

حسن کو بے حجاب دیکھا ہے
کوئی ہوگا نہ میری طرح خراب

جسے کہتے ہیں محبت وہ شئے
بزمِ ہستی کی یہ غفلت کوشیاں

آتشِ دل بھڑک رہی ہے آج
اسے پوشیدہ رکھ سکتا نہیں میں

آج کیسے سکون پاؤں میں ؟
ارغواں سے نکل رہے ہیں راگ

غم نے لوٹی نیند، لوٹا چین بھی
اے سرودِ حیات صدقے جاؤں

جس طرح دریا تمہارے تیرے ساحل

پڑ رہی ہے پھوار ہلکی سی
آئینہ دار ہے دلِ خانہ خراب کا

چارہ گر اپنا کلیجہ تھام لیں
اس طرح آہ آہ کرنے کی

ہمیشہ وقتِ سحر جب قریب ہوتا ہے
لطف آتا ہے خود آرائی میں کیوں

اور برسات کے مہینے میں
لی جگہ آرزو کی حسرت نے

رنگ و بو میں غرق ہوں خاموش ہوں
ڈال دیتا ہے کھیل میں ہل چل

اٹھ کہ تھوڑی سی رات باقی ہے
آج موسم بدل رہا ہے رنگ

ابھی باقی ہیں چند سالم تار
محبت کی طرب افزا امنگیں

یہ کلیوں کی چٹک یہ رونقِ گل
غم سے پر ہے اگرچہ قلبِ حزیں

تمام عمر یہ صدمہ رہے گا میرے ساتھ
میرے پیارے! ادھر تو آؤ تم

نکلتی ہے بے ساختہ منہ سے واہ
پُر مشک زلف پر فسوں آنکھیں

نہ وہ راحت نہ وہ لذت نہ وہ کیف

تجھے اپنے دل کے سوا کیا دوں !
ہوا وہ سارا کاروبار اب ختم

دورِ سوم
(۱۹۶۰ — ۱۹۶۷)

۱۹۶۳ نظمیں اے دل بے کاسہ مست ! قافلۂ نوبہار

۱۹۶۴ نظمیں مساوات ، معبدِ ویران ، نہرو کی وصیت

۱۹۶۵ نظمیں فیصلہ ، ہم البیلے ، مے نوشی
مثنوی دردِ و داغ
رُباعیات بت مجت میں لاکھوں تراشے ایسے
سوتے میں کوئی آہ بھری تو ہو گی
وہ درد کے شعلوں کا بھڑکنا پیہم
جانا ہی نہیں جلوہ کیا ہے ؟

تعمیر مقدر تھی مگر کیا کہیئے !
آفات و حوادث سے بھری ہے دنیا
ہر ساز ہے عمرِ سرمدی پہ بھاری
جنت کے سرابوں کو بھی پیچھے چھوڑا

کیا خاک کرم ہے جو مجھے تو بخشے !
بیتی ہوئی راحتوں کی یادیں جاگیں
مرغوب ہیں لطف و ستم اس دنیا کے
وہ بادۂ عشرت میں ڈوبے ہوئے دن !

محرومۂ احساس سرائیدۂ فکر
آتا نہیں سانسوں میں مزہ جینے کا
یہ مونسِ غم و خوار یہ پیارے اپنے
دنیا کی حدود میں سے باہر ہیں ہم

جینے کی ہر اک راہ بھلا دیتا ہے!
بے مہری قسمت کو نہ بخشوں ہرگز
گم کردہ حلاوتوں کی یادیں ہے ہے!
آج کی دنیا بھی ہے مرنے والی

ممکن نہیں ہم حشر میں روئیں گائیں
سیاروں کی دنیاؤں سے اک صبح بہار
از روئے خیال و حال بیچے ہیں ہم
اس دل پہ قیامت کے ستم بیتے ہیں

کچھ اپنی ستائش میں مزہ آتا ہے
اوندھے مئے رجعت کے پیالے کر دو!
پایا نہ طبیعت نے تجسس سے فراغ
ہرگز نہیں جن سے دل نزار خفا!

اے بخت! مزے کچھ تو اٹھاؤں میں بھی

قسمت سے تباہ ہو تو آخر کیونکر ؟
میرا ہی نہیں سب کا بھلا ہو یارب !
سرسبز رہے گا یوں ہی باغِ توحید

کیا دل کی تمنا بھی غضب ڈھاتی ہے
رودادِ جنوں جس نے کہی ساری عمر
سانسوں نے دیئے کرب و بلا جیتا ہوں
دل اور یہ غوغائے جہاں خوب رہی

ہر دل کو میرا سوزِ جگر دے ساقی
جلتے ہوئے افکار کی لو تیز کر دے !
گو ہر سی ڈھلکتی ہوئی نیندیں میری
ظاہر ہے وہی خنجرِ عریاں کہ جو تھا

اس دردِ سرائی کو نہیں بخشوں گا
روح شمشان ہے یہ ویرانۂ دل

آسودگیٔ ذات نہیں ہو سکتی
آغوشِ گلستاں ہے یہ دنیا گویا

اک بحث میں کہنے لگے اک صوفی غیور

ہوتا ہے حساب آج سراسر بے باق
کیا قہر کو معبود پہ بیٹھا ہے !
ہے کون کہاں کا؟ تجھے کچھ ہوش بھی ہے ؟

آغوشِ مذلت میں سلا دیتا ہے
ظاہر میں مئے جام دسبو پیتا ہوں
ارضیت اپنے بند کستی ہی رہی
کیا حال کہیں مکر و فسوں کا یارو!

کیوں فیض رہے تیرا ادھورا ساقی
تسکین غمِ دل کے لیے جیتا ہوں
بے صرف یوں ہی عمر گنوائی افسوس !
فریاد میری نغمۂ جبریل نہیں !

تقدیرِ ازل آہ تو بھرتی ہوگی !

۱۹۶۶

بھر دے میرا پیمانہ لبالب ساقی
کوتاہیِ فطرت کی سزا کیوں بھگتوں ؟
اللہ کو انسان سے غافل ٹھیراؤں !

تقدیرِ ازل جیتے ہیں جس کے دم سے
جو ہو نہ سکا ہم سے وہ کر جاؤ تم

ساقی! غمِ دل سے ہے برا حال پلا
افسردۂ احساس و نظر پیتا ہوں

منعم! ترے دن رات ہیں وارے نیارے
ماضی کی روایات میں گڑ جاتے ہیں

تقسیمِ ازل کو میں عبث جھٹلاؤں
نالے میرے جاتے ہیں ثریا سے بلند

پوشیدہ زمانے سے نہیں اپنا حال
پنہاں میری آہوں میں ہیں سازِ دل کے جلوس

ساکت ہے نظر روح پہ طاری ہے جمود
معصوم رُخوں میں بھی ملیں گے عیّار

اک معجزۂ عالمِ ناسوت ہے وہ!
افلاک سے تم اہلِ زمیں! پیچھے ہو!

کچھ فیض تو میں نے بھی اٹھایا یارے
کیسے یہ غمِ زیست کے بادل چھائے!

نظروں سے ہے مستور خدا کیا کہیے!
اختر یہ روش تیری ہے فطرت کے خلاف!
قانونِ خدائی نہ بدل جائے کہیں

اے عظمتِ افلاک! تجھے شرم نہ آئی؟ ۱۹۴۷

۱۹۶۷

یہ زیست ہے ایام کی سازش ساقی !
تقدیر جسم دیکھے ہیں کہ خونِ آدم ؟
اے میرے دلِ بے خود و مستی آگاہ !
تو منعمِ زردار اکہ مخمور بھی ہے !
لاریب کسی والی تقدیر سے پوچھ !
وہ یاس کے اُمید کے چشمے پوٹیں !
تشکیک نے ایقان سے محروم رکھا
گفتار شگوفوں کو ملنے والی !

ہر غم جو دردِ دل یہ صدا دیتا ہے
اندازِ نظر غمزۂ غماز نہ ہو
طوفان اٹھاتی ہے بہت یہ دنیا !
ہو جائیں گے حالات دگرگوں اک دن
اک قہر ہے معبود ! جفائے احباب
نقاد اگر ہو تو ہمیں پرتالو
اک تیر کلیجے میں پرو دیا ہم نے
فردوس کو آلام جہاں سے بھر دوں
جنت کی شرابوں کو بہلا دوں دل سے
یہ ضبطِ تکلم ہے کہ اندازِ جنوں ؟
اک ٹیس کلیجے کو مسلتی ہی رہی
جو تخم سعادت تھے وہ بوئے کس نے ؟
اے بے خبرو ! بے جگرو ! بے دردو !

جینے کی بظاہر نہیں کچھ آس ہمیں
اک ساغر زہر آج پلا دے ساقی

کیا کیا نہ ستم جان حزیں پر چھوٹے
اس حال میں لاگ اور لگاوٹ کیا خوب!

نازوں کے پلے تھے پڑے غم کے پالے
مفقود ہے خونِ شہدا کی بو باس

سن لو کہ نہیں ایسی بشارت کوئی
بج اٹھے خموشی میں کہیں جیسے رباب

مجبور ہے قدرت بھی یہاں کیا کہئے
کچھ موقع قسمت آزمائی ہوتا

اس طرح جیے لوگ تو کیا خاک جیے
اللہ وہ امید پرستی میری!

اختر کوئی تدبیر فراغت کر لو
کھپتی ہیں غم عشق میں جانیں لاکھوں

یوں رونے کو ہر نغمہ مرا دے گا
تقدیر نے کچھ تو اس میں ڈالا ہوتا

دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے دم ساز
یوں جانِ عزیز اپنی بھلا کھوئے گا کون؟

ترکش میں بہت تیر لیے پھرتا ہے
سانچوں میں طرب کے ڈھل رہی ہے دنیا

مستی بھی ہے اک نشترِ احساس مجھے

اک لمحے میں ہوتا ہے ادا فرض حیات

پھرتا ہوں لیے سوزِ حیات آنکھوں میں

دل میں مرے نغماتِ ابد پلتے ہیں

ہے ہے وہ سمن پوش سرابوں کے دیار !

کیا بات ہے واعظ ترے سمجھانے کی

پھوڑے میں ابھی تو پل رہی ہے دنیا

مغرور نہ ہو علم پہ اے عالم دین !

قدموں میں سبھی پیر و جواں روندیں گے

کیا کیا نہ ستم ڈھائیں گے دنیا کے مزے

چھاتی پہ زمیں کی مونگ دلنے والے !

مٹی ہوئی برباد نظام زر کی

ہر لمحہ یونہی دل پہ ستم ڈھائے گا

ذرات میں پوشیدہ کچھ انوار نہ ہوں

اس زیست کی راہ میں ہے دونوں یکساں

گلشن سے جھلک اٹھتے ہیں تاریکی میں

ہم حشر میں جائیں گے عجب شان کے ساتھ

وہ غم ہے یہ جس کا نہیں دنیا میں علاج

منہ قول محمدؐ سے نہ موڑو ں ہرگز !

سیلابِ الم شام و سحر بہنے دو !

سوتے سے تجھے جھنجھوڑ دے گا پیارے

ایام کی گردش سے نکلتا ہے تجھے

معبود کے گن گانے پہ مجبور رہے ہے
آلام کے احساس میں کھو کر پی جا
پیتا ہوں میں دن رات شراب اوہام
آدم کو سرِ عام نچایا کس نے ؟
گل اور گریباں دریدہ! ہے ہے
ڈالی ہے حقائق پہ نقاب اوہام
ناظر کی نگاہوں سے لبھانے والے!
ساحر دیکھے خرافیاتی دیکھے!
مرہون تلطف ہو کہ مجبور ستم
وہ ظلم کہ حیوان بھی جس پر شرمائے
ہے ہے یہ اچھل کود کرآتا ہے کون
آتے ہیں خیالوں سے شرارے چھن کر
نس نس میں میری جھمک رہا ہے کوئی زہر
دو دن میں نکل جائیں گے سارے کس بل
جس آتش پنہاں سے شرارے برسے
سن غور سے ان ستم زدوں کے نالے
یہ زیست ستم ڈھائے گی سچ مچ اک دن
ناکس سے بھی ہے مرتبہ کم تر میرا
روتی ہیں ہر روز و شب آنکھیں میری
دل وقت سے مسرور نہیں ہے پیارے
موج طرب آفات کو بلوائے گی

آ صبر کریں شیخ ! خدا ہے والی
نیرنگ جہاں پہ سچ یہ ہے دم بھر کا ہے
اے ذوقِ تماشا ! سبق آموز ہیں ہم
میں بھی تو یہ جانوں کہ میرے بخت پھرے
یہ گردشِ گردوں کے لٹائے ہوئے زخم !

قطعہ ماہیئت اور اقسام

قطعہ اُردو شاعری کا ایک سانچہ ہے۔ دیگر سانچوں اور اصناف کی طرح یہ سانچہ بھی اُردو کو فارسی شاعری کی دین ہے۔ قطعے میں ردیف وقوافی کی ترتیب غزل اور قصیدے کی طرح ہوتی ہے لیکن اس میں مطلع نہیں ہوتا۔ غزل کے برخلاف قطعے کے تمام اشعار میں مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ قطعے کی صنف کا آغاز غزل اور قصیدے سے ہوا۔ غزل کا ہر شعر بہ اعتبار مفہوم مکمل ہوتا ہے دوسرے اشعار سے اس کا ربط ضروری نہیں ہے۔ ایک ہی کیفیت اور تجربے کی توسیع ایک سے زیادہ اشعار میں ہوتی ہے یا ایک خیال کو کئی اشعار پر پھیلا دیا جاتا ہے ان اشعار کو "قطعہ بند" کہا جاتا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے "ق" لکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح قصیدہ میں بھی قطعہ بند اشعار لائے جاتے چونکہ یہ غزل یا قصیدہ میں مطلع کے بعد کسی مقام پہ واقع ہوتا ہے اور اسے غزل یا قصیدے سے الگ کر لیا جائے تو بالعموم وہ بے مطلع نظم بن جاتا ہے اس لئے قطعے کی شرائط میں یہ بات شامل کر لی گئی کہ اس میں مطلع نہ ہو۔ آگے چل کر غزل یا قصیدے سے ہٹ کر بھی قطعے لکھے جانے لگے اس طرح قطعہ شاعری کی ایک مستقل صنف بن گیا۔ اہل عروض نے اس صنف کی تعریف کرنی چاہی اور اس کے سانچے کے حدود متعین کرنے چاہے تو ان باتوں کو اس کی خصوصیات میں داخل کر دیا۔ مضمون مسلسل ہو قوافی و ردیف کی ترتیب قصیدے اور غزل جیسی ہو لیکن مطلع نہ پایا جائے۔ شمس الدین محمد بن قیس الرازی قطعہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"وبیش ازیں گفتہ ایم کی در قصاید پارسی تصریع مطالع لازمت وہر قصیدہ کی مطلع آن مصرع نباشد اگرچہ دراز بود آنرا قطعہ خوانند وسم قصیدہ بر آن اطلاق نکند (ہمچنین) در رباعیات تصریع بیت اول لازم داشتہ اند تا فرق باشد میاں آن و مقطعات دیگر و در مثنویات چنانکہ گفتہ ایم بحکم آنک بناء آن بر ابیات مفردہ است در جملہ قصہ (FAND) تصریع لازمت و باشد کہ یک قصیدہ را چند مطلع کنہ چون از صنعتی بفنی دیگر نقل کند و از جملہ شعراء خاقانی بدین شیوہ موسہ (نز) بودہ است و چند قصیدۂ بسیار مطالع گفتہ چنانک گفتہ است" [1]

علی بن محمدؒ نے قطعے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"وبعض شعرا مقطعات برین وزن گفتہ اند و اگر چہار مصرع خفی گویند و تصریع در مطالع قصیدہ لازمست و باشد کہ یک قصیدہ را چند مطلع ہنند و ہر شعر کہ مطلع آن مصرع نباشد اگرچہ مطول باشد اسم قصیدہ بر آن اطلاق نکند و آنرا قطعہ خوانند و درین صورت مثال حاجت نیست" [2]

نجم الغنی لکھتے ہیں کہ:

"قطعہ بکسر اوّل و سکون ثانی اس کے لغوی معنی ٹکڑے کے حرف اول کے فتح کے ساتھ غلط ہے مگر بعض فصحائے متاخرین نے فتح بھی جائز رکھا ہے اصطلاح شعر میں مراد ہے ان چند ابیات سے کہ جن میں ایک بیت کا مطلب دوسری بیت سے متعلق ہو یعنی جب تک دوسری بیت

---

[1] المعجم فی معائر اشعار عجم، ص ۱۹، ۲۰

[2] دقائق اشعرا ، ص ۸۶، ۸۷

نہ معلوم ہو مطلب نہ کھلے اور بیت اول مقفٰے نہ ہو اور بنائے قافیہ بیت اول کے مصرعہ ثانی پہ ہو اور دوسری بیتیں قافیہ میں اسی مصرعہ کی تابع ہوں۔ اب غزل میں بھی قطعے پائے جاتے ہیں مگر متقدمین کے نزدیک غزل میں قطعہ لکھنا معیوب تھا۔ شعرائے نے حد قطعہ دو بیت سے لے کر ایک سو سترہ اشعار تک مقرر کی ہے"[1] غرض ایسے اشعار قطعہ کہلاتے ہیں جن میں مطلع نہ پایا جائے، بیت غزل کی ہو اور مضمون مسلسل ہو۔

قطعہ اور رُباعی کا فرق

جدید دور میں بالعموم چار مصرعوں پر مشتمل قطعات لکھے جاتے ہیں اور ان میں مطلع کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے قطعے اور رُباعی بظاہر ہم شکل معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں کی تکنک میں بہت فرق پایا ہے۔ رُباعی کے لئے بحر ہزج کے چوبیس ارکان مخصوص ہیں لیکن قطعہ کے لئے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے رُباعی میں مطلع ضرور ہونا چاہیئے جبکہ قطعہ میں مطلع کا نہ ہونا شرط ہے لیکن جدید دور کے قطعہ نگاروں نے یہ شرط اٹھا دی ہے اور اب قطعہ میں مطلع بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کا لزوم نہیں۔ اس طرح چار مصرعوں کے مطلع والے قطعہ اور رباعی میں صرف اوزان کا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

قطعہ کی قسمیں

فنی اعتبار سے قطعے کی مختلف قسمیں کی جا سکتی ہیں قطعہ در غزل، مستقل قطعے، دوبیتی قطعے، نظم (قطعے

---

[1] بحر الفصاحت، ص ۸۶-۸۷

کے سانچے میں) وغیرہ ۔

غزل میں دو یا دو سے زیادہ اشعار مسلسل ہوں تو انہیں "قطعہ بند" کہا جاتا ہے۔ ایسے قطعے غزل ہی کا جزو ہوتے ہیں۔ ان کی آزادانہ حیثیت نہیں ہوتی۔ غزل کے دو یا زیادہ اشعار کے درمیان بالعموم مضمون کا تسلسل ہوتا ہے لیکن ہر شعر اپنی جگہ منفرد بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ اشعار باہم اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں غزل سے الگ کر دیتے پر وہ مستقل قطعہ یا نظم معلوم ہوتے ہیں۔ قطعہ در غزل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تیرے جو یا ہیں اس چمن میں ہم
ڈھونڈے ہے گل کو عندلیب اے دوست

ق

تو برا مان مت مضائقہ کیا
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

(سودا)

شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

ق

گذرا کے خوشی سے جہاں میں تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

(میر تقی میر)

جاگا جو بزمِ عیش و طرب میں وہ صبح تک
دیکھا نظیرؔ شرم سے ہم نے یہ حالِ شمع
ایسی چھپی وہ پردۂ فانوس میں کہ پھر
وقتِ سحر تلک نہ گیا انفعالِ شمع
(نظیرؔ اکبرآبادی)

مستقل قطعے

غزل سے ہٹ کر بھی غزل کے مانند ردیف و قوافی کی ترتیب کا التزام کرتے ہوئے مستقل قطعے لکھنے کا رواج قدیم دور سے رہا ہے۔ قدیم زمانے میں تہنیت و تعزیت کے لئے بالعموم ایسے قطعے لکھے جاتے تھے اور کبھی کبھی آخری شعر یا مصرع سے تاریخ بھی نکالی جاتی تھی بعض شعراء نے اخلاقی مذہبی اور دیگر موضوعات پر بھی مستقل قطعے لکھے ہیں۔

سوداؔ نے بادشاہ کو عید نوروز کی مبارکباد دیتے ہوئے حسب ذیل قطعہ پیش کیا تھا۔

تری محفل میں شمع دولت افروز
ہوا یہ سال نو فرخندہ فیروز۔
تری طبع مبارک کو جہاں میں
ہوا اس سال کی ہے فرحت آموز
فروغ فیض سے تیرے ہے روشن
بسانِ شمع جو تیرا ہے دل سوز

نگاہ تیری فلک کی باز گشتی
ترے اعداد کو ہے عیدِ جگر سوز
تفضل سے جناب مرتضیٰ کے
تجھے ہر روز ہوئے عیدِ فیروز

اخلاقی موضوع پر میر کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو :

آئی نظر جو گورِ سلیمان کی ایک روز
لوحے پہ اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کائے سرکشاں جہاں میں کھینچا تھا میں بھی سر
پایانِ کار مورِ کی خاک قدم ہوا

تاریخ گوئی کے لئے شعرأ نے زیادہ تر قطعے کا سانچہ استعمال کیا ہے۔ اس طرح قطعہ تاریخ بھی قطعہ کی ایک قسم قرار پاگیا۔ اُردو میں تاریخی قطعے اس کثرت سے لکھے گئے ہیں کہ وہ تفصیلی مطالعے کا موضوع بن سکتے ہیں۔ نمونے کے طور پر غالب کا یہ قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو۔

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا انشراحِ جشنِ جمشید

جشنِ جمشید کے حروف سے سنہ ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

نظم (قطعے کے سانچے میں)

قدیم دور کے نظم نگار شاعروں نے اور بعد ازاں حالی اور ان کے معاصرین

نے نظم نگاری کے لئے قطعے کا سانچہ بھی استعمال کیا اور ان نظموں کو قطعے ہی سے موسوم کیا جاتا رہا۔ بعد کے دور میں جب نظم نگاری کا رواج عام ہوگیا تو سانچوں کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف نظم کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ قطعے کو بھی نظم کہا جانے لگا۔ جدید دور میں قطعے کے سانچے والی نظم اور قطعے میں اس طرح فرق کیا جاتا ہے کہ اگر اشعار کی تعداد زیادہ ہو تو نظم کہتے ہیں اور اگر وہ صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہو تو قطعہ ہے۔ قطعے کے سانچے والی نظموں میں بالعموم مطلع بھی لایا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے کلام میں کئی مسلسل غزلیں ملتی ہیں جنہیں عنوان لگاکر مرتب کلیات نے نظم کی شکل دے دی ہے جیسے سکھ بلاس کی عید الجھیلی بسنت، نوروز، سانولی وغیرہ۔ حالیؔ کی نظم شعر سے خطاب قطعے ہی کے سانچے میں ہے۔ جدید دور میں بے شمار نظمیں قطعے کے سانچے میں لکھی گئی ہیں مثلاً گکشی جی (سرورؔ جہاں آبادی) بدلی کا چاند (جوشؔ ملیح آبادی) عہد نو (سیمابؔ اکبر آبادی) آج کی دنیا (فراقؔ گورکھپوری) ایک بار دیکھا ہے (اخترؔ شیرانی)

دو بیتی قطعہ (جدید قطعہ)

جدید دور میں عام طور پر چار مصرعوں والے قطعے لکھے جاتے ہیں۔ بعض اصحاب کا یہ خیال کہ اس طرح کے قطعے جدید دور کی ایجاد ہیں۔ درست نہیں ہے ایسے قطعے قدیم شعرا کے کلام میں بھی مل جاتے ہیں۔ قدیم دور میں قطعے کے لئے کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ ۱۷ شعر کی تحدید قائم کی گئی تھی۔ جدید دور میں قطعے کے نام سے بالعموم دو شعر ہی کہے جاتے ہیں اور مطلع کہنے میں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ مطلع والے دو بیتی قطعے قدیم دور میں بھی ملتے ہیں۔ دو شعر والے قطعے اب اتنے معروف اور مانوس ہوگئے ہیں کہ قطعے کے نام کے ساتھ ہی ذہن

میں چار مصرعوں والے قطعے کا تصور آتا ہے۔ چار مصرعوں والے چند قطعے بطور نمونہ
پیش کئے جاتے ہیں۔

تیرے جویا ہیں اس چمن میں ہم
ڈھونڈتے ہے گل کو عندلیب آ دست
تو برا مان مت معاذ اللہ کیا
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

(سودا)

ظلموں میں کسی کی جو گرفتار نہ ہوتا
پھر کام مجھے تجھ سے شب تار نہ ہوتا
مرنا بھی لکھا ہے میری قسمت میں عزیزاں
گر زندگی ہوتی تو یہ آزار نہ ہوتا

(درد)

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

(اکبر)

کل اپنے مریدوں سے کہا پیر مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے در ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند (اقبال)

یہ لینے آیا تجھے کون کالے کوسوں سے
مجھے تو اس کی جوانی پہ رحم آتا ہے
کہ عنقریب کھلے گا یہ تلخ راز اس پہ
ترا جمال محبت کو ذبح کھاتا ہے
(احمد ندیم قاسمی)

موضوع اور اس کی پیش کش کے اعتبار سے بھی قطعے کی چند اقسام کی جا سکتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے قطعے کو دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ رسمی قطعے ۲۔ غیر رسمی قطعے۔

۱۔ رسمی قطعے

قدیم دور میں قطعے کی صنف کو زیادہ تر رسمی موضوعات کے لئے استعمال کیا گیا۔ کسی عید یا تقریب مسرت کے موقع پر مبارکباد دینے کے لئے قطعے لکھے جاتے تھے اور کبھی ان قطعوں میں آخری شعر یا مصرع سے تاریخ بھی نکالی جاتی تھی۔ اسی طرح غم کے موقعوں پر بھی تعزیت کا اظہار قطعوں میں کیا جاتا تھا۔ عمارت یا کسی یادگار چیز کی تعمیر پر بھی تاریخی قطعے لکھنے کا رواج رہا ہے۔ یہ قطعے بیشتر رسمی نوعیت کے ہوتے تھے خاص طور پر ایسے قطعے جن میں تاریخ کہی جاتی تھی تاریخ بالعموم چند الفاظ یا ایک مصرعہ سے نکالی جاتی تھی لیکن یا تخرج کی ضرورت ہو تو مکمل شعر سے تاریخ نگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اب ان چند لفظوں یا مصرعوں یا اشعار کو محفوظ کرنے اور ایک تشکل دینے کے لئے قطعے کی صورت میں مزید چند اشعار موزوں کئے جاتے تھے۔ اس طرح جو قطعے لکھے جاتے تھے۔ ان میں شاعر کے حقیقی جذبات و احساسات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ان میں آورد زیادہ ہوتی تھی۔ آج کل اس

طرح کے قطعے لکھنے کا رواج کم ہوگیا ہے۔ امیر کا یہ قطعہ جو انھوں نے نواب رام پور کی صحت یابی پر لکھا تھا اسی نوعیت کے قطعوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہزار شکر کہ نواب کو ہوئی صحت
ہر اک دور بلا ہوگئی شفا پائی
کہا یہ میں نے پئے ندر مصرع تاریخ
دعائے خلق دوا ہوگئی شفا پائی

۲۔ غیر رسمی قطعے

غیر رسمی قطعوں میں وہ سارے قطعے شامل ہونگے جن میں شعرا نے اپنے حقیقی جذبات اور تجربات پیش کئے ہیں۔ ان میں عشقیہ متصوفانہ اخلاقی سیاسی ہر طرح کے قطعے شامل ہیں۔

غیر رسمی قطعے میں بھی پیش کش کے طریقے اور پیرائے اظہار کے اعتبار سے مختلف قسم کے قطعے ملتے ہیں۔ بعض قطعے بیانیہ ہوتے ہیں بعض غنائی اور بعض کا اسلوب افسانوی ہوتا ہے۔

قدیم دور میں زیادہ تر بیانیہ قطعے رائج رہے۔ غزلوں کے قطعہ بند اشعار میں بالعموم غنائی اسلوب ملتا ہے۔ حکایتی اور افسانوی اسلوب میں بھی بعض قدیم شاعروں نے قطعے کہے ہیں۔ لیکن اس طرز کو جدید دور میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی کے بیشتر قطعے مختصر منظوم افسانے ہوتے ہیں اس قسم کے قطعے دوسرے جدید شعرا کے پاس بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ذیل میں مختلف اسالیب اور موضوعات رکھنے والے قطعوں کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

بیانیہ اسلوب :-

کہا کلام یہ سودا نے ایک عاقل سے
کسو سے ربط کوئی زیر آسماں نہ کرے

کیا جو تجربہ ان دوستوں کو بد پایا
بدی کا جن پہ کسی طرح دل گماں نہ کرے

چکھا انھوں کی جو اے یار دوستی کا شہد
وہ تلخ کام کو زہر دشمناں نہ کرے

بغیر بخل و حسد چاہیے کوئی مذکور
انھوں کا مہر و مروت کے درمیاں نہ کرے

میں ان سے مل کے ندان اختیار عزلت کی
دوچار انھوں سے خدا مجھ کو در جہاں نہ کرے

(سودا)

غنائی اسلوب:

کچھ کشش نے تری اثر نہ کیا
تجھ کو اے انتظار دیکھ لیا
تشنگی اور بھی بھڑکتی گئی
ہوں جوں میں آنسوؤں کو ابھر لیا

(درد)

جو آنسو آنکھ سے ٹپکے وہ نظروں سے نہاں کیوں ہو
الٰہی حاصل درد محبت رائیگاں کیوں ہو
یہ منشائے جاناں ہے تو افشائے راز جاں کیوں ہو
کمال ضبط بھی اے دل اک انداز بیاں کیوں ہو

(جگر)

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے ترا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب تیرے گیسو ترا کنار نہیں
(فیض احمد فیض)

افسانوی اسلوب

ناگہاں اک اور اوپر جا پڑا میرا قدم
تب سے اس شخص کی آواز آئی کان میں
یعنی وہ یہ بیت پڑھتا تھا بصد حزن و الم
اذ ریب باغباں تا فصل شد اے عندلیبا
پیش ازیں من ہم دریں باغ آشیانے داشتم
(حاتم)

ڈھول بجتے ہیں دنا دن کی صدا آتی ہے
فصل کٹتی ہے چمکتی ہے پھسلی جاتی ہے
نوجوان گاتے ہیں جب سانولے محبوب کا گیت
ایک دوشیزہ ٹھٹک جاتی ہے شرماتی ہے
(احمد ندیم قاسمی)

اُردو میں قطعہ نگاری کا آغاز و ارتقاء

اُردو میں قطعہ نگاری کی ابتداء کب ہوئی اور کس شاعر نے سب سے پہلے قطعے لکھے یہ بات ہنوز تحقیق طلب ہے لیکن قدیم شعراء کے ہاں ایسی غزلیں اور منظومات ضرور ملتی ہیں جن میں کسی مضمون کو مسلسل باندھا گیا ہے۔ امیر خسرو کی پہلیوں اور مکرنیوں میں ایسے نمونے مل جاتے ہیں۔

گھوم گھمیلا لہنگا پہنے ایک پاؤں سے رہے کھڑی
آٹھ پیر ہیں اس ناری کے صورت اسکی لگے بُری
سب کوئی اسکی چاہ کریں گبرو مسلمان ہندو چھتری
خسرو نے یہ کہی پہیلی دل میں اپنے سوچ ذری

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں کئی موضاتی غزلیں ہیں جنھیں

عنوان لگا کر مرتب کلیات نے نظم قرار دیا ہے۔ ان غزلوں کو نظم کہنا اس لئے درست نہیں ہے کہ ان میں ایسے اشعار بھی شامل ہیں جو باعتبار مضمون دوسرے اشعار سے ربط نہیں رکھتے لیکن ان میں مسلسل اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی صورت قطعہ بند اشعار کی ہے ان کو الگ کر دیا جائے تو ان پہ قطعے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ایسے مسلسل اشعار اکثر مطلع ہی سے شروع ہوگئے ہیں اور قطعے کی روایتی تعریف کی رو سے اس میں مطلع نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن قدیم زمانے ہی سے قطعہ نگاری میں شاعروں نے اس شرط کی پابندی نہیں کی۔ اس امر کے پیش نظر قلی قطب شاہ کی مسلسل غزلوں کے اشعار پہ قطعے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سکھو بلاس کی عید، تھنڈ کالا، کنٹھ مال، چھبیلی وغیرہ۔ اس طرح اُردو شاعری کے اوّلین دور میں بھی ہمیں قطعہ نگاری کے نمونے مل جاتے ہیں اگرچہ اس دور میں اس صنف کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دوسری اصناف سخن کی طرح قطعہ نگاری کا بھی رواج تھا۔

غواصی کے کلیات میں چند منظومات قصیدے یا غزل کی ہیئت میں ملتی ہیں جن میں کسی خاص موضوع پہ مربوط خیالات پیش کئے گئے ہیں انہیں نہ تو قصیدہ کہا جا سکتا ہے اور نہ غزل۔ مطلع کے اضافہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ قطعہ ہی ہیں۔ قدیم اصناف کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں قطعے کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ مرتب کلیات غواصی نے انہیں نظم کا نام دے کر اسی غلطی کا اعادہ کیا ہے جو مرتب کلیات قلی قطب شاہ نے اس کی مسلسل غزلوں کو نظم سے موسوم کرتے ہوئے کی تھی۔ جب کہ نظم کی اصطلاح کسی صنف سخن کے لئے قدیم زمانے میں رائج ہی نہ تھی۔ غواصی کے قطعات میں سے صرف ایک قطعہ جو ملکہ حیات بخشی بیگم کی مدح میں ہے بے مطلع ہے چند قطعے بزرگان دین حضرت علیؓ، حضرت حیدر، پاشا وغیرہ کی مدح

میں لکھے گئے ہیں چند قطعات بادشاہ کی مدح میں ہیں۔ ایک قطعہ بادشاہ کی سیر بھونگیر پر لکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ شب برات، سیر چاندنی، بقر عید، برسات اور موسم سرما پر چند قطعے ملتے ہیں۔ اخلاقی موضوعات پر دو قطعے شامل ہیں ایک قطعہ میں سہیلی کے حسن کی توصیف کی ہے۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اُردو شعر و ادب کے چرچے جس مقام پر ہوئے وہ اورنگ آباد تھا۔ ۱۶۸۷ء کے بعد پایۂ تخت کی منتقلی کی وجہ سے دکن کے متعدد اہل کمال اورنگ آباد منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں اُردو شاعری کا چراغ مدہم سہی لیکن جل رہا تھا۔ اس عہد کے نمائندہ شاعر ولیؔ نے دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ قطعہ نگاری پر بھی توجہ کی۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے یہاں متصوفانہ اور عشقیہ ہر دو قسم کے قطعے پائے جاتے ہیں۔ تصوف سے انہیں دلچسپی ضرور تھی لیکن طبعی طور پر وہ ایک عاشق مزاج شاعر تھے اور ان کا یہ رنگ ان کے قطعات میں بھی صاف نظر آتا ہے مثال کے طور پر ان کے یہ دو قطعے پیش کئے جاتے ہیں۔

یوسف حسن آج دستا ہے
جا کے لینے کوں جیو ترستا ہے
مدعی کوں کہو کہ جیو دیوں گا
وہ نہ دیونگا جو جی میں وستا ہے

آہ سوں مجھ جگر منں چھید ہوئے
فاش مجھ عاشقی کے بھید ہوئے
اس سیہ دل سوں جا کہو یارو
رو رو دیدے میرے سفید ہوئے

شمالی ہند میں ولی کے جو ہم عصر فارسی گو شاعروں نے اُردو کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ان میں یہ نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سعد اللہ گلشن، سلیمان قلی خان، وادؔ، قزلباش خان اُمیدؔ، عبد القادر بیدلؔ، علی قلی خان ندیمؔ، سراج الدین علی خان آرزوؔ وغیرہ۔ ان کے علاوہ چند شاعر ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اُردو میں باضابطہ شاعری کی اور اپنے دیوان مرتب کئے مثلاً فائزؔ، شاہ حاتمؔ، آبروؔ، مظہر جان جاناں وغیرہ۔ اس دور میں قصیدہ، غزل، مثنوی اور دیگر اصناف سخن کے ساتھ قطعہ نگاری کی اچھی عکاسی کرتا ہے۔

ایک دن حاتم میں جاتا تھا بیاباں کی طرف
ناگہاں اک گور اوپر جا پڑا میرا قدم

خاک سے اس شخص کی آواز آئی کان میں
یعنی وہ یہ شعر پڑھتا تھا بعد سوز والم

" از فریب باغبان غافل مشو اے عندلیب
پیش ازیں من ہم دریں باغ آشیانے داشتم

اس دور میں اُردو شاعری کا ایسا چرچا ہوا کہ فارسی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ اس کے بعد کی نسل خالص اُردو گو شعراء پر مشتمل ہے جن میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر حسن خواجہ میر دردؔ، اور میر سوزؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعراء کے یہاں اکثر قطعہ بند غزلیں پائی جاتی ہیں اس زمانے میں تاریخی اور تہنیتی قطعوں کا بھی رواج ہوا۔

سوداؔ کو قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل رہی ہے لیکن وہ منفرد غزل گو شاعر بھی تھے۔ وہ بیانیہ اور غنائی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے غزلوں میں قطعہ بند اشعار بھی کہے ہیں اس کے علاوہ تاریخی موضوعاتی قطعے بھی لکھے ہیں:۔

کہا کلام یہ سودا سے ایک عاقل نے
کسو سے ربط کوئی زیر آسمان نہ کرے

کیا جو تجربہ ان دوستوں کو سیہ پایا
بدی کا جی پہ کس طرح دل گمان نہ کرے

چکھا انہوں نے جو اے یار دوستی کا شہد
وہ تلخ کام کبھو زہر دشمناں نہ کرے

بغیر بخل و حسد چاہئے کوئی مذکور
انہوں کا بہرِ مروت کے درمیاں نہ کرے

من آں سمجھ کے ندان اختیار عزلت کی
دو چار انھوں سے خدا مجھ کو در جہاں نہ کرے

میر کو اُردو کے تمام بڑے شعرا اور نقادوں نے خدائے سخن مانا ہے اور ان کی عظمت اور برتری کا اعتراف کیا ہے۔ میر طبعاً غنائی شاعر ہیں انہوں نے بیانیہ اصناف جیسے قصیدہ[۱] مثنوی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ میر نے غزلوں میں قطعہ بند اشعار کے علاوہ مستقل قطعے بھی کہے ہیں۔ بعض قطعات میں اخلاق اور حکیمانہ مضامین کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پہ یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

مت ڈھلک مژگاں سے تو اب اے سرشک آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

۱ے قصیدہ کی صنف کا شمار غنائی شاعری میں ہوتا ہے لیکن اُردو میں زیادہ تر مدحیہ قصائد لکھے گئے ہیں۔ یہ شاعر کے اصلی جذبات سے تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان میں بیانیہ انداز غالب نظر آتا ہے۔

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پہ مت پھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

درد کے کلام میں اور اصنافِ سخن کے ساتھ قطعے بھی ملتے ہیں مندرجہ ذیل دو بیتی قطعہ، قطعے میں ان کے مخصوص رنگ کی عکاسی کرتا ہے۔

کچھ کشش نے تیری اثر نہ کیا
تجھ کو اے انتظار دیکھ لیا

تشنگی اور بھی بھڑک گئی
جوں جوں میں آنسوؤں کو اپنے پیا

اس کے بعد اردو شعر و ادب کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے عام طور پر دبستان لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء جراءت، انشاءؔ اور مصحفی سے ہوتی ہے۔ علمیت کا غیر ضروری مظاہرہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کا اہتمام خیال کے مقابلے میں زبان کو زیادہ اہمیت دینا اس دبستان کی وہ خصوصیات ہیں جو ناسخ اور ان کے شاگردوں کے یہاں عروج پر نظر آتی ہیں۔ ان شعراء نے قطعہ بند غزلوں کے علاوہ تہنیتی قطعے اور تاریخی قطعے بھی لکھے اور دوسری اصناف سخن کے ساتھ یہ صنف بھی ترقی کی زینے چڑھتی رہی۔

انشاءؔ طبعاً شوخ اور زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ ان کی تقریباً تمام تخلیقات میں ان کی چلبلی طبیعت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ ان کی متعدد غزلوں میں قطعہ بند اشعار پائے جاتے ہیں ان کے قطعے ان کے عام عاشقانہ رنگ کے ترجمان ہیں۔
مصحفی کی متعدد غزلوں میں قطعہ بند اشعار پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ مستقل اور تاریخی قطعے بھی پائے جاتے ہیں۔ مستقل قطعے ان کے حکیمانہ رنگ کے

عماذ ہیں۔ دیوان ناسخ میں قطعہ درغزل، تاریخی قطعہ اور تہنیتی قطعے یعنی قطعے کی تقریباً تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد ایک طویل عرصے تک دلی تباہ و تاراج رہی اور یہاں کے اہلِ کمال مختلف مقامات کو منتقل ہوگئے لیکن انیسویں صدی کے اوائل میں دلی نے ایک بار پھر سنبھالا لیا۔

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں پھر ایک بار دلی کی چہل پہل عود کر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ خاموش ہونے سے پہلے بھڑک سا اٹھا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو شعر و سخن اور فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی چنانچہ ان کے زمانے میں پھر ایک بار اردو شاعری کو فروغ ہوا۔ اس زمانے کی اہم ادبی شخصیتیں شاہ نصیر، شیخ ابراہیم ذوق، اسد اللہ خاں غالب، مومن خان مومن ہیں۔

ذوق نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے غزلوں میں بھی قطعہ بند اشعار کہے ہیں اور الگ سے بھی لکھے ہیں۔ ان کے قطعے موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے روایتی ہیں وہ قطعہ کے معنوی دائرے کو وسیع نہیں کرسکے انھوں نے قطعہ کو کوئی نیا موضوع اور دلچسپی نہیں عطا کی البتہ ان کو قطعہ نگاری کی جو روایت ورثہ میں ملی تھی انھوں نے اسے اچھی طرح برتنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے ہے۔ بطور نمونہ ذیل میں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے۔

ہے باغ جہاں میں تجھے گر ہمت عالی
کر گردن تسلیم کو خم اور زیادہ

ق

لیتے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ

غالب ایک غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ انھوں نے قطعہ نگاری میں نئے تجربے کیے اور قطعہ کی محدود دنیا کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ نئے موضوعات پہ قلم اٹھایا اور ان کو دلچسپی عطا کی۔ غالب نے روایتی موضوعات کو بھی دلکش انداز میں پیش کیا۔ بہر حال غالب نے قطعے کی دنیا کو وسعت دینے کی کوشش اور نئے راستے بنائے۔ مثال کے طور پہ ان کے قطعے "چکنی ڈلی" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے

خامہ انگشت بہ دندان کہ اسے کیا کہیئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے

مہر مکتوب عزیزاں گرامی لکھیئے
حرز بازوے شکر خاں خودآرا کہیئے

مستی آلودہ سرانگشت حسیناں لکھیئے
داغ طرف جگر عاشق شیدا کہیئے

کیوں اسے تکیہ پیراہن لیلا لکھیئے
کیوں اسے نقش پئے ناقہ سلما کہیئے

بندہ پرور کی کف دست کو دل کیجیئے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیئے

مومن خاں مومن نے ۱۳۲ اشعار کا ایک قطعہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

مرا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بیدرد کو لکھوں

کہ مجھ کو تختۂ مشق اطبّا کیوں بنایا ہے

اس قطعہ میں مومن نے طبّی اصطلاحات استعمال کی ہیں اور پورے قطعے میں مختلف امراض کی علامتوں سے بحث کی ہے۔ آخر میں عم افلاطون نے مرض کی تشخیص کی اور سودائے عشق اور دردِ حسرت جیسے امراض کو لا علاج بتایا ہے۔ اس طرح کا تجربہ مومن کی انفرادیت اور جدّت پسندی کا غماز ہے۔

غدر کے بعد اردو میں جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ محکمۂ تعلیمات پنجاب کی ملازمت کے دوران میں کرنل ہالرائڈ کے ایما پر آزاد نے جدید نظم کے مشاعروں کی بنا ڈالی۔ اور خود انھوں نے بھی ان مشاعروں کے لئے نظمیں کہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا الطاف حسین حالی بھی لاہور میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ چند مشاعروں میں انھوں نے بھی حصّہ لیا سر سیّد نے بھی جدید نظم کی حوصلہ افزائی کی اس طرح اردو میں نظم نگاری کا باضابطہ رواج ہوا۔ ابتداً جو نظمیں لکھی گئیں ان کے لئے اردو شاعری کے متداول سانچے استعمال کئے گئے اور نظموں کو بھی سانچوں مسدس، مثنوی وغیرہ ناموں سے موسوم کیا گیا۔ اس سلسلے میں قطعے کے سانچے کو بھی استعمال کیا گیا۔ مثال کے طور پر حالی کا قطعہ "شعر سے خطاب" پیش کیا جا سکتا ہے۔

حالی اور آزاد نے مختلف اصناف کی داخلی خصوصیات اور موضوع کی تخصیص کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ان کے اوپری ڈھانچے کو نظم نگاری کے لیے استعمال کیا۔ اس لئے ان کی ایسی تمام تخلیقات کو نظم ہی سے موسوم کرنا مناسب ہوگا۔

حالی کے معاصرین میں شبلی نے نظمیں بھی لکھیں اور قطعے بھی۔ بعض قطعے چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اور جدید قطعے کا آہنگ رکھتے ہیں۔

انہوں نے چند طنزیہ اور ظریفانہ قطعے بھی لکھے مثلاً

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک
یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بنا ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
حال بھی آئے گا اب تک تو یہ قوالی ہے

اس دور کے شعراء میں اکبر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے قطعے کو محض سانچے کے طور پر نہیں برتا بلکہ ایک صنف سخن کا درجہ دیا۔ یوں تو اکبر کے کلام میں قطعے کے سانچے میں نظمیں بھی ملتی ہیں لیکن ان کے علاوہ کئی قطعے ایسے ہیں جو چار مصرعوں پر مشتمل ہیں اور داخلی ربط اور آہنگ کے اعتبار سے رباعی کا مزاج رکھتے ہیں اور جدید قطعے کا یہی وصف اسے قدیم قطعے سے مختلف بتاتا ہے اس اعتبار سے اکبر الہ آبادی کو جدید قطعہ نگاری کا بانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ذیل میں چند قطعات کی پیش کشی بے محل نہ ہوگی۔

تائید وضع ملت و دیں کر رہا ہوں میں
اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش
پر جب ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

لا مذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاح قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے یہ آپ
کعبے سے بت نکال دیئے تھے رسول نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

اکبر کی قطعہ نگاری سے متاثر ہو کر ان کے کئی معاصرین نے چار مصرعوں والے طنزیہ اور مزاحیہ قطعے لکھے۔ اقبال کے کلام میں ایسے کئی قطعے ملتے ہیں جن میں اکبر کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدّ نظر
وضع مشرق کی جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائیگا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

انتہا بھی اس کی آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی اگر حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

اقبال نے قطعے کے سانچے کو کسی قدر تحریف کے ساتھ نظموں کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی نظمیں "ایک آرزو، شمع و شاعر، زندگی" وغیرہ کا فارم قطعے کا ہے صرف آخری شعر میں ردیف و قوافی بدل دیئے گئے ہیں۔

اقبال کے معاصرین اور بعد کے شعرا نے بند وار سانچوں کے علاوہ قطعے اور مثنوی کے سانچوں کو اپنی نظموں میں برتا لیکن پیش رو شاعروں کی طرح ان کو اصناف کے ناموں سے موسوم نہیں کیا۔ اس زمانے میں ایسے مختصر قطعے بھی لکھے جاتے رہے جن میں سے بیشتر چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے تھے اور انہیں نظم کہنے کے بجائے قطعہ کا

نام ہی دبا گیا اس طرح قطعہ نگاری کی تاریخ میں ایک موڑ آتا ہے۔ جہاں ایک طرف قطعے کا سانچہ نظم کی صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف قطعے کو نظم سے میز کرتے ہوئے مستقل صنف سخن کے طور پر اظہار کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس رجحان کا یہ اثر ہے کہ اب اگر قطعے کا نام لیا جائے تو ہمارا ذہن ان نظموں کی طرف منتقل نہیں ہوتا جو اس سانچہ میں لکھی گئیں بلکہ جدید قطعے کی طرف خیال جاتا ہے۔

مشہور غزل گو شعراء فانی، یاس، اصغر اور جگر کے کلام میں جدید قطعے یا دوبیتی قطعے کے نمونے مل جاتے ہیں۔ فانی کی شاعری زندگی سے بیزاری کے واضح نقوش رکھتی ہے۔ وہ عام طور پر یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے اور غم و آلام کا شکار رہے ہے اس کی زندگی عارضی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان آزادی اور اختیار چاہتا ہے۔ مسرت کی خواہش کرتا ہے۔ یہی خیالات ان کے قطعات کے موضوع ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل قطعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

دم لینے کی تو مہلت ملنا ہی چاہیئے تھا
دن رات بحر غم میں کیا فرق چاہیئے تھا
فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

اس کے علاوہ انہوں نے چند قطعے سماجی مسائل بالخصوص ہندوستانی سماج میں عورتوں کی زبوں حالی کے بارے میں بھی لکھے ہیں۔

اصغر گونڈوی صاحب فکر شاعر تھے۔ تصوف اور فلسفہ سے گہرا لگاؤ تھا اس لئے ان کے کلام میں رچا ہوا متصوفانہ اور حکیمانہ رنگ ملتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک طرح کی والہانہ کیفیت سرشاری و سرمستی کا عالم نظر آتا ہے۔ ان کے قطعے بھی اسی رنگ کے حامل ہیں۔

افتادگی راہ کی منزل کو نہ سمجھا
آخر نہ دیا ساتھ میری ہم سفری نے
اس جلوۂ بے کیف سے محروم بھی رکھا
کم بخت کبھی ہوش کبھی بے خبری نے

جگر مراد آبادی کی شاعری کے موضوع زیادہ تر شراب، حُسن اور معاملاتِ عشق ہیں۔ وقت اور حالات کی کروٹ نے اس مخصوص تغزل کے علاوہ سیاسی اور معاشرتی موضوعات کو بھی شاعری میں ڈھالنے پر مجبور کیا۔ جگر اس میں بھی کامیاب ہوئے یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور چھوٹے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی
سایہ ہے لیکن روشن روشن

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں جدید دور میں زیادہ تر چار مصرعوں والے قطعے لکھے جانے لگے اور بعض شاعروں نے ان قطعوں کو نظموں کی طرح عنوان دینا شروع کیا۔ اس نوع کے قطعے کو مقبول بنانے اور ایک مستقل صنف کی حیثیت دینے میں اختر انصاری نے خاص حصہ لیا۔ اختر انصاری نے قطعے کو اپنا خاص فن بنایا اور مسلسل قطعات لکھ کر ادبی رسائل میں شائع کرواتے رہے اور پھر ان کو مجموعے کی صورت میں ترتیب دے کر شائع کروایا۔ قطعے کے فن سے اختر انصاری کے مزاج کو جو مناسبت رہی ہے اور اس صنف کو فروغ دینے میں ان کا جو حصہ رہا اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قطعہ کے ذکر کے ساتھ ہی اختر انصاری کا نام زبان پر آجاتا ہے

اختر انصاری کے علاوہ قطعہ نگاری میں جو نام نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے وہ احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ بڑے اچھے افسانہ نگار بھی ہیں شاعری میں نظم غزل اور قطعہ پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے قطعے اردو میں بالکل نئی چیز ہیں۔ اس نوع کے قطعے نہ تو ان سے پہلے کسی نے لکھے اور نہ ہی ان کی کسی نے کامیاب تقلید کی۔ ندیم قاسمی کے قطعے کا خاص وصف ان کی افسانویت ہے۔ حکایتی انداز کے چند قطعے قدیم شاعروں کے پاس مل جاتے ہیں لیکن ان کا انداز بیانیہ ہے۔ ندیم قاسمی کے قطعوں میں افسانویت کے ساتھ داخلی جذبات اور کیفیات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ان کا طرز اظہار ایمائی ہے وہ تفصیلات میں نہیں جاتے

صرف اشارے کر دیتے ہیں۔ جذبات نگاری اور محاکات سے بھی کام لیتے ہیں۔ افسانوں کی طرح اپنے قطعوں میں بھی انھوں نے زیادہ تر دیہاتی ماحول کو پیش کیا ہے۔ ان کے قطعوں کے دو مجموعے "دھڑکنیں اور رم جھم" شائع ہو چکے ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:

میری بچھڑی کو بہت طول نہ دینا بھیا
اس طرح راہ میں کھو جاتی ہے سب کہتے ہیں
کونسی فوج میں شامل ہیں مجھے یاد نہیں
بس یہ معلوم ہے ایران میں وہ رہتے ہیں

شکستہ مقبروں میں ٹوٹتی راتوں کو ایک لڑکی
لئے ہاتھوں میں بربط جوگ میں کچھ گنگناتی ہے
کہا کرتے ہیں چرواہے کہ جب رکتے ہیں گیت اسکے
تو اک تازہ لحد سے چیخ کی آواز آتی ہے

مستقل قطعہ نگاروں میں زریش کمار شاؔد کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ زریش کمار شاد میں شعر گوئی کی اعلیٰ صلاحیتیں تھیں لیکن بسیار نویسی کی وجہ سے وہ ایک اعلیٰ معیار ہر جگہ برقرار نہیں رکھ سکے۔

شاؔد کے قطعوں کا ایک مجموعہ "قاشیں" کے نام سے شائع ہوا۔ اخترؔ انصاری نے شاؔد کے قطعات پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"انھوں نے اس کی مخصوص تکنک کو خوب سمجھا ہے اور بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے .... مواد اور موضوع کے اعتبار سے انہوں نے نہ صرف اپنے ترقی پسندانہ رجحانات کو زندہ اور باقی رکھا ہے بلکہ اپنے مطالعے کے حدود کو بھی آگے بڑھایا ہے اور اپنی ہمدردیوں کے دائرے کو بھی وسیع تر کیا ہے" [1]

شاؔد کے رنگ سخن کا اندازہ ذیل کے قطعوں سے لگایا جا سکتا ہے،

ذہن پر گرد سی جمی دیکھی
نبض ہستی تھمی تھمی دیکھی

جس نے بھی مجھے دیکھا
اس نے مجھ میں مری کمی دیکھی

اثر اندازی نشاط و الم
حسب افتاد طبع ہوتی ہے
کچھ دماغوں میں غم بھی ہنستے ہیں
کچھ دلوں میں خوشی بھی روتی ہے

---

[1] شاؔد کے قطعات "قاشیں" (دہلی ستمبر ۱۹۶۷ء)، ص ۱۵

جدید دور کے ایک اور شاعر جنہوں نے قطعہ کی صنف پر خاص توجہ کی عبدالحمید عدمؔ ہیں۔ عدمؔ نے رباعیات بھی کثرت سے لکھی ہیں۔ ان کی رباعیوں اور قطعوں میں عشقیہ اور خمریاتی رنگ حاوی ہے۔ اس کے علاوہ وہ روزمرّہ زندگی کے مشاہدات و تجربات کو حکیمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہات نادر اور دلکش ہوتی ہیں۔

ایسے جیتا ہوں جیسے شیشے کے
ٹوٹے حصوں کو جوڑتا ہے کوئی

یا ترستی ہوئی امنگ کے ساتھ
خواب میں پھول توڑتا ہے کوئی

شام ہے اور پار ندی کے
ایک ننھا سا بے قرار دیا
یوں اندھیرے میں ٹمٹماتا ہے
جیسے کشتی کے ڈوبنے کی صدا

جان نثار اخترؔ بھی قطعہ نگار شعرائ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے قطعوں کا ایک مجموعہ "گھر آنگن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :

یہ کس کا ڈھلک گیا ہے آنچل
تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے
یہ کس کی مچل پڑی ہیں زلفیں
جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی

کیوں رنگ برس پڑا چمن میں
کیا قوس قزح لچک کے ٹوٹی

ترقی پسند دور میں جدید طرز کے دو بیتی قطعوں کو بے حد مقبولیت حاصل رہی۔ اس دور کے تقریباً تمام نمائندہ شاعروں کے کلام میں قطعات مل جاتے ہیں لیکن چند ایک شاعروں کے سوا جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں کسی نے اس صنف کو اپنا مستقل فن نہیں قرار دیا۔ ترقی پسند شعراء میں جنہوں نے قطعہ نگاری کی صنف کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا چند قابل ذکر نام یہ ہیں :

فیض احمد فیضؔ، ساحرؔ لدھیانوی، مخدومؔ محی الدین، دانشؔ سردار جعفری، جگن ناتھ آزادؔ، سلیمان اریبؔ وغیرہ۔

اختر انصاری کی قطعہ نگاری

اختر انصاری نے یوں تو غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، وہ اُردو کے اچھے افسانہ نگار اور نقاد بھی ہیں لیکن انھیں قطعہ نگار شاعر کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس صنف سخن کو انھوں نے اپنے اظہار کا خاص ذریعہ بنایا۔ انھوں نے بے شمار قطعے لکھے اور پھر ان کے مجموعے بھی شائع کیے دوسرے یہ کہ قطعے کی حیثیت اُردو شاعری میں محض ایک سانچے کی تھی۔ اسے اختر انصاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت دی۔ ایک تیسری وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اختر انصاری کی شعری صلاحیتیں قطعے کی صنف ہی میں زیادہ اجاگر ہوتی ہیں۔ اختر انصاری نے قطعے کو مستقل صنف کی حیثیت دیتے ہوئے اس میں بعض فنی خصوصیات پیدا کیں جن کا التزام قدیم قطعات میں نہیں ملتا۔ اس بناء پر وہ اپنے قطعات کو جدید قطعات کا نام دیتے ہیں۔

جدید قطعہ دراصل مختصر نظم ہوتا ہے جس میں مصرع بہ مصرع خیال کی تعمیر ہوتی ہے۔ قطعے میں کوئی مصرع بھی غیر ضروری اور بھرتی کا نہیں ہوتا۔

اختر انصاری نے اپنے قطعوں میں اس فنی وصف کو خاص طور پر ملحوظ

رکھا ہے ۔ جدید قطعے کے لئے انھوں نے چار مصرعوں کی قید رکھی ہے اور خود انھوں نے جتنے بھی قطعات لکھے ہیں وہ چار مصرعوں پر مشتمل ہیں ۔ اپنی شاعری کے آغاز ہی سے اختر انصاری نے قطعے کی صنف پر توجہ کی۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ روح" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جس میں ۶۹ قطعات ۳۱ غزلیں اور ۲۱ نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد بھی انھوں نے نظموں اور غزلوں کے مقابلے میں بکثرت قطعات لکھے۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ان کے قطعات کا مجموعہ "آبگینے" شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ایک قطعہ نگار شاعر کی حیثیت سے انھیں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی جیسا کہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے : ۔

"ان کے ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے قطعات کو حاصل ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اختر انصاری سے پہلے اردو قطعہ نگاری ایک ضمنی سی چیز تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس طرح فارسی میں خیّام نے اپنی رُباعیات میں اپنی پوری شخصیت کو منتقل کر دیا ہے اور اس طور پر ایک غیر فانی حیثیت اختیار کر لی وہی کام اُردو میں اختر انصاری نے قطعہ نگاری کے سلسلے میں کیا ہے جن لوگوں نے "آبگینے" پڑھی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ یہ قطعات احساس کی نزاکت ، جذبات کی شدت اور رومانی و جمالیاتی کیفیات کے کتنے حسین اور دل آویز نمونے ہیں۔ چونکہ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کا نیا اور منفرد تجربہ تھا اس لئے خود اختر انصاری کے فنّی اکتسابات میں سب سے زیادہ ان قطعات کا مقبول ہونا ایک فطری امر ہے یہی ایک ایسا میدان ہے جس میں اب تک ان کا کوئی حریف نہیں " [1]

---

[1] رفتار ، ہماری زبان (علی گڑھ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اپنے ایک مضمون "نئے اسالیب نظم" میں اختر انصاری کے قطعات کو ایک نیا تجربہ قرار دیا ہے:

"اختر انصاری کے خالص رومانوی اور ہلکے پھلکے قطعات بھی اُردو میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے تھے اور پہلی بار اُردو کے ایک شاعر نے قطعے کو اپنی امتیازی شان بنایا۔ یہ قطعے حقیقتاً آبگینے ہیں لیکن آب گینوں میں شراب کی تند و تیز آگ نہیں ہے یہ وہ شراب ہے جو خمار آلود سرور تو بخشتی ہے لیکن بدمست نہیں کرتی۔" ؎

آبگینے کے بعد ان کے منتخب قطعات کا مجموعہ "پرطاؤس" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک کے بہترین قطعات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ جس میں جدید قطعات کے ساتھ پرانے قطعات کا انتخاب بھی شامل تھا۔ ۱۹۶۲ء میں قطعات کا ایک اور مجموعہ "ٹیڑھی زمین" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے قطعات کے بارے میں ڈاکٹر وارث کرمانی رقم طراز ہیں:

"ٹیڑھی زمین" کے قطعات "آبگینے" کی منزل سے بہت آگے کی چیز ہیں..... "آبگینے" کے قطعات کی پرالم غنایت اور حزنیہ رومانیت "ٹیڑھی زمین" کے قطعات کی بلند سنجیدگی مفکرانہ متانت اور متمردانہ صلابت میں اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے۔ ان نئے قطعات میں شعریت اور حسن کاری کا التزام پورے طور پر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذریعے زندگی، فطرت، سماج اور کائنات کے بارے میں جس انوکھے زاویے کی تشکیل اور جس مرکشانہ رویے کی تفسیر ہوتی ہے وہ بیک وقت تخلیقی فن کا

کارنامہ بھی ہے اور دانش ورانہ فکر کا اعجاز بھی ہے" ۱؎

قطعہ نگاری کی حیثیت سے اختر انصاری کو جدید اُردو شعرا میں جو مقام حاصل ہے اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ انھوں نے کثیر تعداد میں قطعے لکھے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں انھوں نے فنی اعتبار سے اس صنف کو استحکام بخشا دوسری طرف ان کی اپنی قطعہ نگاری کا اسلوب بھی منفرد ہے۔ ذیل میں ہم ان کی قطعہ نگاری کی بعض نمایاں فنی خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

قطعہ مختصر نظم کی طرح کسی ایک خیال کیفیت یا تاثر پر مبنی ہوتا ہے جسے شاعر کم سے کم لفظوں میں پیش کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے قطعے میں ایمائیت اور اختصار سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اختر انصاری کے قطعات میں یہ وصف پایا جاتا ہے وہ اپنے منفرد اور اچھوتے تجربوں اور مشاہدوں کو چار مصرعوں میں بھرپور طریقے سے پیش کر دیتے ہیں مثلاً

اندھیری رات خموشی سرور کا عالم
بھری ہے قہر کی مستی ہوا کے جھونکوں میں

سکوت بن کے فضاؤں پہ چھا گئی ہے گھٹا
برس رہی ہیں خدا جانے کیوں یہ آنکھیں

آخری مصرع میں بات وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ محض اشارہ کر دیا گیا ہے۔ آنکھوں کے برسنے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن کی طرف قاری کا ذہن منتقل ہوتا ہے اس ایما کی وجہ سے قطعے میں مفہوم کی مختلف سطحیں ابھرتی ہیں۔ ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔

۱؎ اختر انصاری کی شاعری" دوام ۔ شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۷۰ء

..... اور بات کو صاف لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے ایمائیت سے کام لیکر تہہ دار بنا دیا گیا ہے۔

چڑھا ہوا ہے فضاؤں کو ایک نشہ سا
شراب ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شئے آج
اٹھی ہے درد کی مانند کالی کالی گھٹا
خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

قطعات نگاری میں اختر انصاری نے تشبیہہ سے بھی خاص طور پر کام لیا ہے۔ ان کے اکثر قطعات تشبیہوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تشبیہہ کے ذریعہ ایمائی انداز میں مکمل بات کہہ جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کسی خیال کسی خاص حالت یا کیفیت کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے:

اس طرح پھر رہے ہیں آنکھوں میں
اپنی عمر گذشتہ کے سائے
جیسے ویرانے میں کوئی چھکڑا
کھڑ کھڑاتا ہوا گذر جائے

قطعے میں شاعر نے اپنی عمر گذشتہ کی کوئی روداد پیش نہیں کی لیکن جو تشبیہہ اس نے استعمال کی ہے وہ عمر گذشتہ کا سارا احوال بیان کر دیتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عمر گذشتہ کی یاد شاعر کے دل میں کیا کیا کیفیات پیدا کرتی ہے۔ ویرانے میں چھکڑے کا کھڑکھڑاتا ہوا گذر جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ماضی کا سفر حیات اپنے اندر کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں رکھتا تھا۔ شاعر کا ماضی ایک ویرانے کے مانند تھا اس کی زندگی میں کوئی دلکشی اور رعنائی نہیں تھی۔ چھکڑا محدود وسائل حیات کا استعارہ ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زندگی آلام و مصائب میں بسر ہوتی۔

کبھی وہ قطعہ میں کسی منظر کو بیان کرتے ہیں اور ایسی تشبیہات لاتے ہیں جن سے ان کی قلبی کیفیات اجاگر ہو جاتی ہیں ان قطعوں میں بھی زندگی اور کائنات پر براہ راست کوئی تبصرہ نہیں ملتا لیکن ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ شاعر کا نظریہ اس بارے میں کیا ہے۔

موت کی سی پرسکون ویرانیاں
فرش سے تا عرش ہیں چھائی ہوئی
چاندنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف
رات کی میت ہے کفنائی ہوئی

شاعر نے اپنی داخلی کیفیات کو ایک خارجی صورت دی ہے اور وہ ایک منظر کی شکل اختیار کر گیا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ خارج کا مشاہدہ داخلی کیفیات میں تحلیل ہو کر ایک المناک منظر بن گیا ہے۔ چاندنی کو دیکھ کر ایک پرسکون ویرانی کا احساس ہوتا ہے۔ ویرانی عام طور پر وحشت خیز ہوتی ہے لیکن موت کی ویرانی سکون کی کیفیت رکھتی ہے۔ رات سے ویرانی کا احساس ہو رہا ہے تو چاندنی اس ویرانی کو پرسکون بنا رہی ہے۔ رات کو میت اور چاندنی کو کفن سے تشبیہہ دیکر موت کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

اختر انصاری نے محض لطف سخن کے لئے تشبیہات کا استعمال نہیں کیا ہے تشبیہہ کے ذریعہ وہ خارجی مشاہدے اور داخلی کیفیات کو اس طرح مربوط کر دیتے ہیں کہ ان میں دوئی باقی نہیں رہتی۔ کبھی وہ کسی داخلی کیفیت، جذبے یا تاثر کو تشبیہہ کے ذریعہ خارجی منظر میں ڈھال دیتے ہیں۔ خود ان کے قول کے مطابق:

رموز قلب رقم ہیں بہار کے رخ پر
جو نقش ہے اثر خامہ محبت ہے

تجھ بھی علم ہے اے موسم بہار کے تو
کسی کے نام مرا نامۂ محبت ہے

خارجی مظاہر کے ذریعہ اظہار جذبات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

اس طرح قلب میں پنہاں ہے تصور تیرا
جس طرح چاند گھٹاؤں میں چھپا ہوتا ہے
سینہ معمور ہے یوں تیری حسین یادوں سے
آسمان جیسے ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شئے ہے گویا
جام سرشار سے چھلکی ہوئی مئے ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں
تری رفتار اس گیت کی لئے ہے گویا

جیسے شعلوں سے کوئی کھیلے پھاگ
جیسے گاتا ہو کوئی دیپک راگ
جل رہا ہوں تمہاری جان سے دور
بھڑک اٹھی ہے میرے دل کی آگ

بعض قطعات میں خارجی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان میں داخلی جذبات اور کیفیات کو سمو دیا ہے :۔

پھوار، ابر، پرندوں کے گیت، مست ہوا
بھرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
ہزار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر
وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

چاند کے پاس اک ستارہ تھا
میں نے دیکھا تو اشک بہنے لگے
کوئی مجھ سا نہ ہو تمنائی
ایسی حسرت خدا کسی کو نہ دے

فضا امڈی ہوئی ہے اک چھلکتے جام کی مانند
ہوا مخمور ہے بادل غریق رنگ و مستی ہیں
مرا سرشار دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے اختر
یہ بوندیں پڑ رہی ہیں یا تمنائیں برستی ہیں

چڑھا ہوا ہے فضاؤں کو ایک نشہ سا
شراب ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شئے آج
اٹھی ہے درد کی مانند کالی کالی گھٹا
خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

اختر انصاری کے قطعات کا ایک خاص وصف ان کا کہانی پن ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی طرح ان کا ہر قطعہ ایک مکمل مختصر کہانی نہیں ہوتا بلکہ مختلف قطعات مل کر ایک کہانی ترتیب دیتے ہیں۔ یہ شاعر کی اپنی داستانِ حیات ہے اس لئے ان قطعوں میں آپ بیتی کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ میرا جی نے "آبگینے" کے قطعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وصف کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے۔

اس کتاب میں . . . . ایک کہانی ہے ایک داستانِ محبت ہے جس کا ہیرو ایک غیر معمولی حساس اور نفاست پسند شاعر ہے لیکن وہ محض ایک جذباتی انسان ہی نہیں ایک فن کار بھی ہے . . . . . .
(اس پریم کہانی کا) ایک جوان ہے۔ جوانی ہی اس کے لئے اس نغمہ جوانی کا سبب بن رہی ہے۔ "پکار ہے یہ مری دکھ بھری جوانی کی" اس نوجوان کا ذہنی ماحول بالواسطہ یوں ظاہر ہوتا ہے۔
"ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی، چاندنی تھی اور دریا تھا۔ اس تصور میں اگر ہم گاہے گاہے پھواروں کی سازندگی کو بھی شامل کریں تو وہ تمام بنیادی اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں جن سے ہیرو متاثر ہوتا ہے اس کے دل کی الم پسندی اس کے ہر ہر لفظ پہ چھائی ہوئی ہے بلکہ اسے ایک طرح سے اذیت ہی میں دل کشی محسوس ہوتی ہے۔" [1]

اختر انصاری کے قطعات (بالخصوص عشقیہ قطعات) میں جو گہری داخلیت ہے اس نے بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے قطعات میں ایک "افسردگی کسک اور ایک تحت نغمہ کی سی کیفیت" پیدا کر دی ہے یہ قطعات آپ بیتی ہیں تو ان کا مخاطب بھی خود شاعر کی اپنی ذات ہے۔ اس لئے ان کے لہجہ میں خود کلامی کی کیفیت نمایاں

---

[1] "آبگینے پر تبصرہ" ادبی دنیا (لاہور۔ ستمبر ۱۹۴۱ء)

ہے ذیل کے قطعات اور اشعار میں لہجے کا یہ انداز ملاحظہ ہو :-

ع اٹھی ہے درد کی مانند کالی کالی گھٹا

ع خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

ع بجھی ہوئی ہے طبیعت اداس رہتا ہوں

ع کہاں گئے مرے اللہ وہ ہنسی کے دن

گلشن باغ اور بزم طرب
چاندنی حسن شعر اور گانے
پھر بھی میں بے قرار ہوں اختر
چاہتا کیا ہے دل خدا جانے

اختر اب چھوڑ دیا غم نے تمہیں
اب نہیں درد تمہارے دل میں
پھر یہ راتوں کو لب دریا تم
کیوں بھرا کرتے ہو ٹھنڈی آہیں

۱۹۵۰ء کے بعد کے قطعات میں موضوعات کی تبدیلی کے ساتھ اختر انصاری کے لہجہ اور اسلوب میں بھی تغیر محسوس ہوتا ہے اس تبدیلی کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا ہے :

" بعد کے دور کے قطعات میں رومانیت سے ان کا رشتہ بظاہر ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے کیوں کہ اس دور میں انکے رویے کو بڑی حد

تک مخالف رومانیہ رجحان کا نام دیا جا سکتا ہے .... اس مقام
پر وہ جدید شاعری اور جدید شاعروں کی حقیقت پسندی اور کرب
وافسردگی کی سطح کو چھو لیتے ہیں بعد کے قطعات میں زندگی زیادہ ،
سنجیدہ گمبھیر اور بڑی تلخ حقیقت بن کر سامنے آتی ہے ......
یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اختر انصاری جبر کے فلسفے کو تسلیم کرتے
ہیں اور ارادہ و اختیار کی تہی دستی کے شکوہ سنج ہے لیکن دراصل
ان کی جبریت بھی زندگی اور موجودہ معاشرے پر گہرا طنز ہے" لے
یہی طنز ان کے لہجے اور اسلوب کا جزو بن گیا ہے۔ اختر انصاری کے طنز میں
ویسا ہی تیکھا پن پایا جاتا ہے جو عمر خیام کی رباعیوں میں نظر آتا ہے۔ طنز کی وجہ سے
ان کے لہجے میں تندی اور تلخی پیدا ہونے کے بجائے ایک حزن آمیز تفکر کی کیفیت
نمایاں ہوئی ہے۔ اختر انصاری کے لہجے کی اس خصوصیت کا اندازہ ذیل کے قطعات
سے ہو سکتا ہے :-

یہ بوسیدہ پھٹی گدڑی، یہ سوراخوں بھری کملیں
جسے سب آسمان کے نام سے موسوم کرتے ہیں
تری رحمت کے قرباں اس کو نیچے پھینک دے یارب
زمیں والے بہت راتوں کی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں

اس میں ارمان دفن ہیں اس میں امنگیں دفن ہیں
اس میں امیدیں، تمنائیں، مرادیں، دفن ہیں

لے "پرطاؤس پر تبصرہ" ۔ ہماری زبان (علی گڑھ ۔ ۱۵۔ اپریل ۶۸ ۱۹ء)

حشر کے دن یہ زمین اگلے گی سوزِ آرزو
اس میں انسانوں کے بدلے آرزوئیں دفن ہیں

کچھ اس طرح سے جوشِ تغیر تھا ہوا
سچ مچ ہو جیسے وقت کا پہیہ رکا ہوا
قائم ہے ایک حال پہ بدحالیٔ جہاں
اے گردشِ فلک تری غیرت کو کیا ہوا

اک شورِ بے اماں کہ ترانہ کہیں جسے
اک تشنگی کہ پینا پلانا کہیں جسے
کیا کہیئے کس فریب کے مارے ہوئے ہیں ہم
اک ابتری کہ نظم زمانہ کہیں جسے

خالقِ دوزخِ جہاں سن تو
ہم غریبوں پہ یہ ستم کیوں ہو
تونے فردوس تو بنایا ایک
اور جہنم بنا دیے دو دو

حرفِ کن سے یہ جو اک شور مچایا تونے
آدمی کو جو سرِ عام نچایا تونے

اپنے کس جذبۂ موہوم کی تسکین کے لئے
اس قدر درد بھرا سوانگ رچایا تو نے

اختر انصاری ایک غنائی شاعر ہیں ان کے قطعات میں بھی جذبات کی شدت اور درون بینی نمایاں ہیں۔ ان کے جذبات تجربے اور مشاہدے کے آفریدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے قطعہ خواہ کسی موضوع پر ہو اس کے طرز احساس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر زندگی اور کائنات کو کس زاویہ سے دیکھ رہا ہے۔
اختر انصاری کے قطعات کے موضوع حسن و عشق، مناظر فطرت، رقص و موسیقی اور حیات و کائنات کے مسائل ہیں۔
اختر انصاری ایک جمال پرست شاعر ہیں کیٹس اور شیلی کی طرح انھوں نے زیادہ تر حسن و عشق کے گیت گائے ہیں۔ اپنی شاعری کے آغاز میں وہ ادب برائے ادب کے نظریہ کے قائل تھے اور آج تک بھی وہ ادب اور شاعری کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں ان کے بیشتر قطعات حسن اور کیفیات عشق سے لبریز ہیں۔ (۱۲) بڑھی ہوئی جمال پرستی کا انھیں احساس بھی ہے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں:۔

کیف و سرور و بہجت و مستی کی خیر ہو
یعنی مذاق عشرت ہستی کی خیر ہو
کیا کیا حسین زخم ہیں زینت فزودل
اللہ اس جمال پرستی کی خیر ہو

ایک اور قطعے میں اپنے مذاق حسن کی انتہا پسندی کی تصویر اس طرح کھینچ دی ہے:۔

معانِ غم و سردیِ انجمن معلوم ہوتی ہے
تپش دل کی بہاریا میں معلوم ہوتی ہے
مرا کافر مذاقِ حسن اب تم پر چھپتے کیا ہو
مجھے اپنی تباہی بھی حسین معلوم ہوتی ہے

خارجی دنیا میں ان کی نگاہیں حسن کی متلاشی رہتی ہیں۔ فطرت انھیں حسن کی تجلیوں معمور نظر آتی ہے۔ اس طرح وہ نسائی حسن کے بھی بڑے شیدا اور پرستار ہیں۔ ایک قطعہ میں انھوں نے حسن کو نغمے سے تشبیہ دی ہے۔ حسن نغمہ ہے اور وہ بھی نغمۂ دلگیر۔ فنونِ لطیفہ میں نغمے اور موسیقی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہیت و مولد ایک جان و یک قالب ہو جاتے ہیں۔ شاعری، مصوری، رقص اور سنگ تراشی کی معراج یہ ہے کہ وہ نغمے کی لطافت کو پا لے۔ نغمہ کمال فن ہی نہیں کمال حسن بھی ہے۔ اب اختر انصاری کا قطعہ ملاحظہ کیجئے:۔

حسن ہے ایک نغمۂ دل گیر
اور نغمہ ہے روح افزا حسن
دونوں جذبات خیز ہیں یعنی
حسن نغمہ ہے اور نغمہ حسن
اس لطافت کو پا نہیں سکتا
چاندنی کا جمال پاکیزہ
تیرا پیکر لطیف ہے ایسا
جیسے کوئی خیال پاکیزہ

اختر انصاری کی شاعری بالخصوص قطعات میں نسائی حسن کے مختلف پہلوؤں کی دلکشی اور جاذب نظر تصویریں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نظارہ حسن

سے پیدا ہونے والی کیفیات کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے احساس کی انفرادیت بھی ہماری توجہ کو کھینچتی ہے :۔

روبرو ہے وہ چاند سی صورت
جس کا ہر دم خیال آتا ہے
میں ہوں بے تاب دیکھنے کے لئے
اور دل ہے کہ دھڑکا جاتا ہے

نگاہِ اولین کی یہ کیفیت بھی دیکھئے :۔

ہائے کیا قہر تھی وہ پہلی نظر
جس میں محسوس یہ ہوا اختر
مجھ پہ گویا کسی نے پھینک دی ہیں
ایک مٹھی میں بجلیاں بھر کر

نسائی حسن کی مختلف کیفیات اور اثرات کو اختر انصاری نے کس طرح لفظوں میں اسیر کیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے قطعات سے ہو سکتا ہے :۔

رخِ رنگیں پہ پڑ گئیں نظریں
اور نظروں سے لڑ گئیں نظریں
مل کے پلٹیں تو یہ ہوا معلوم
عمر بھر کو اجڑ گئیں نظریں

باتیں کرتے میں پھول جھڑتے ہیں
برق گرتی ہے مسکرانے میں

نظریں جیسے فراخ دل ساقی
خم لنڈھائے شراب خانے میں

کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شئے ہے گویا
جام سرشار سے چھلکی ہوئی مئے ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں
تیری رفتار اُسی گیت کی لے ہے گویا

مسکرائی وہ جب تو میں سمجھا
کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا
ہنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم
دستِ ساقی سے جام چھوٹ پڑا

کر رہی ہو تم کسی سے گفتگو
پڑ رہی ہے یا گلستاں میں پھوار
یہ تمھارے ہنسنے کی آواز ہے
بج رہا ہے یا کہیں کوئی ستار

اس طرح قلب میں پنہاں ہے تصور تیرا
جس طرح چاند گھٹاؤں میں چھپا ہوتا ہے

سینہ معمور ہے یوں تیری حسین یادوں سے
آسماں جیسے ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

دیدار کے بعد اظہارِ محبت کا مرحلہ آتا ہے عرضِ حال کی دشواریوں کو تو اکثر شاعروں نے بیان کیا ہے لیکن عرضِ حال کے بعد کی کیفیت کو کم ہی کسی نے پیش کیا ہے اختر انصاری نے ایک قطعہ میں اس کیفیت کا دلکش مرقع پیش کیا ہے :-

میں نے جب اس سے کہا تم سے محبت ہے مجھے
اس نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
آہ! لیکن دل ناشاد (یہ غارت ہو جائے)
اس قدر دید ہے دھڑکتا رہا کچھ سن نہ سکا

پھر ملاقاتیں جاری رہتی ہیں ایک ملاقات کی کیفیت ملاحظہ ہو :-

یہ ملاقات لوٹے لیتی ہے
عشق کی گھات لوٹے لیتی ہے
کر لو اختر گواہ تاروں کو
آج کی رات لوٹے لیتی ہے

گوشہ باغ کی ملاقاتیں
اور راز و نیاز کی باتیں
اے دل ارمان رہ جائیں گے
پھر نہ ہوں گی نصیب راتیں

آغازِ محبت میں عشق ان کے لئے وجہ نشاط بن جاتا ہے اور وہ نشۂ عشق میں

سرشار نظر آتے ہیں:-

ہو کے بے فکر تان اڑائے جا
راگنی اپنے من کی گائے جا
غم نہ کر روزگار کا پیارے
عشق کی بانسری بجائے جا

دو دلوں کی محبت اے اختر
ہے اک ایسی مئے نشاط انگیز
جس کی مستی میں کائنات تمام
نظر آتی ہے حسن سے لبریز

جنون عشق ایسی ہمت اور طاقت بخشتا ہے کہ غم حیات کو وہ آسانی کے ساتھ جھیل سکتے ہیں۔

کسی نے میرے مقدر سے کر دیا منسوب
جنونِ عشق کو بھی گردشِ جہاں کو بھی
غرض اٹھائے ہوئے ہوں میں اپنے شانوں پر
زمین ہی کو نہیں ہفت آسمان کو بھی

آغاز عشق کی کیفیات سے آگے اختر انصاری کے قطعات میں معاملات عشق کا بیان کم ملتا ہے۔ اگر ان کے قطعات سے اس داستان عشق کو ترتیب دیا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ آغازِ عشق کے بعد وہ ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہوئے۔ ان کے بیشتر قطعات اس صورت حال سے پیدا ہونے والی مایوسی اور

اندرونی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں سے کام لیتے ہوئے انھوں نے اپنے غم کی مختلف کیفیات کو بڑا کاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ جدائی کی صبر آزما گھڑیاں اس طرح شروع ہوتی ہیں :-

ایک صبر آزما جدائی ہے
ملنے جلنے کی بند ہیں راہیں
میں نے اس ماہ رو کی گردن میں
ڈال دی ہیں خیال کی باہیں

پھر وہی عشق جو وجہ نشاط تھا انگاروں کا بستر بن جاتا ہے :-

جیسے شعلوں سے کوئی کھیلے پھاگ
جیسے گاتا ہو کوئی دیپک راگ
جل رہا ہوں تمہاری جان سے دور
بھڑک اٹھی ہے میرے دل کی آواز

عالم فراق میں ضبط غم اور اظہار غم کے مراحل آتے ہیں۔ ضبط حال سے غم کی کیفیات حسین و جمیل بن جاتی ہیں :-

بربط ضبط فغاں کی زمزمہ باری تو دیکھ
اشک پنہاں کی نظر افروز گل کاری تو دیکھ
پیار آجائے تجھے بھی اے مشیت تو سہی
میرے اندوہ تمنا کی طرح داری تو دیکھ

مناظر فطرت، بہار، برسات اور چاندنی راتیں بھی عاشق کی ان کیفیات کا ساتھ دیتی ہے :-

پھوار ابر پرندوں کے گیت مست ہوا
بھرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر
وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

چڑھا ہوا ہے فضاؤں کو ایک نشہ سا
شراب ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شئے آج
اُٹھی ہے درد کی مانند کالی کالی گھٹا
خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

فضا اُمڈی ہوئی ہے اک چھلکتے جام کی مانند
ہوا مخمور ہے بادل غریق رنگ و مستی ہیں
مرا سرشار دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے اختر
یہ بوندیں پڑ رہی ہیں یا تمنائیں برستی ہیں

یہ بوندیاں یہ ہوائیں یہ کیف بار سماں
مرے حواس پہ اک بے خودی سی چھائی ہے
تجلیاتِ مسرت سے قلب ہے معمور
مگر بہار کسی کا سلام لائی ہے

قطعات ذیل میں ضبط غم کی مزید کیفیات ملاحظہ کیجئے:۔

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

جو پوچھتا ہے کوئی سرخ کیوں ہے آج آنکھیں
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں پہ ہرگز نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

غم فراق میں پھر وہ منزل آتی ہے جب وہ خارجی عالم، مظاہر فطرت اور موسیقی میں اپنی کیفیات قلب کا عکس دیکھنے لگتے ہیں۔ کبھی فطرت کا حسن اور موسیقی، ان کے دل میں غم کے جذبات کو تیز کر دیتے ہیں اور کبھی وہ ان کے ہم درد و غمگسار بن جاتے ہیں۔

آبِ دریا میں ہے جس طرح روانی پنہاں
جیسے الفاظ میں ہوتے ہیں معانی پنہاں
نغمہ گر یوں ہی ترے درد بھرے نغموں میں
ہے مرے درد محبت کی کہانی پنہاں

دل حسرت زدہ میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے
محبت آہیں بھرتی ہے تمنائیں ترستی ہیں

کوئی دیکھے بھری برسات کی راتوں میں حال اپنا
گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے اور آنکھیں برستی ہیں

ہوش کو اعتبار کھونے دو
ضبط کو پائمال ہونے دو
دل حرماں زدہ کو آج کی رات
چاندنی سے لپٹ کے سونے دو

رفتہ رفتہ جب مایوسیاں بڑھتی ہیں تو دل ضبط غم کی تاب کھو دیتا ہے اب اسے گریہ میں لذّت محسوس ہوتی ہے اور آہیں اس کے سوز الم کا مداوا بن جاتی ہیں۔

آرزوئیں نہ رہیں حسرت و ارمان نہ رہے
یعنی پہلو سے مرے وہ دل دیوانہ گیا
چھٹ گئے اور سب اندازِ جنوں تو لیکن
دوسرے تیسرے دن کا مرا رونا نہ گیا

تمام عمر میں آنسو بہاؤں گا اختر
تمام عمر یہ صدمہ رہے گا میرے ساتھ
کہ اپنے آپ کو میں نے فروخت کر ڈالا
کسی کو پانے کی ناکام آرزو کے ساتھ

غم عشق آخریں مکمل مایوسی کی صورت اختیار کر جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا اندوہ و الم آرزوؤں اور تمناؤں سے ماورا ہو جاتا ہے۔ اس بدنصیبی اور محرومی

دوام کی حالت کو بھی اختر انصاری نے موثر پیرائے میں پیش کیا ہے مظاہر فطرت یہاں بھی شاعر کی کیفیات قلب سے مطابقت پیدا کر لیتی ہیں۔

وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی
وہ شب کو خون رونے کی عادت نہیں رہی
محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تلخیاں
شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

کسی کو غمِ عشق کا ہے سہارا
کسی کو تمناؤں کا آسرا ہے
مگر جس کی اُمیدیں سب مرچکی ہیں
الٰہی وہ ناشاد کیوں جی رہا ہے

سینہ خالی ہے اُف رے سناٹا
جیسے ویرانہ سائیں سائیں کرے
اور دل کا یہ حال سینے میں
دوپہر جیسے بھائیں بھائیں کرے

موت کی سی پر سکوں ویرانیاں
عرش سے تا فرش ہیں چھائی ہوئی
چاندنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف
رات کی ہیئت ہے کفنائی ہوئی

حسن و عشق سے ہٹ کر مناظرِ فطرت اور رقص و موسیقی اور ان سے طاری ہونے والی کیفیات پر اختؔر انصاری نے مستقل قطعہ لکھے ہیں اور اُردو شاعری کے کیف و جمال میں دلکش اضافہ کیا ہے :-

پنہائے آسماں پہ ہیں طاری اداسیاں
ہے ہے سکوتِ شام کی پیاری اداسیاں
ہنگامہ ہائے زیست سے فرصت اگر ملے
رکھ لوں اٹھا کے دل میں یہ ساری اداسیاں

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں
دفعتہً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روتے روتے کھل کھلا کر ہنس پڑا

آسمان کے ہاتھ میں ہے اک ستار
پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھوار
آہ ان نغمات سے ہے مرتعش
سازِ دل کا کوئی نا معلوم تار

نغمہ ہے آگ جانتا ہوں میں
لیکن اللہ بات یہ کیسا ہے
آگ تو ملتہب ہے بربط میں
اور دھواں میرے دل سے اٹھتا ہے

زہرہ آہنگ مطرب جس وقت
طرب افزا سروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں
ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

تہ و بالا ہے زندگی کا نظام
وجد کرتی ہے کائنات تمام
پاؤں کی لرزشیں یہ کہتی ہیں
دیکھنے والے اپنے آپ کو تھام

کر دیا حافظے میں حشر بپا
اور ماتھے میں بجلیاں بھر دیں
انگلیوں کو فضا میں لہرا کر
تو نے اک داستاں رقم کر دی

اختر انصاری کے قطعات کا ایک اہم موضوع "زندگی" اس کا اسرار اور المیہ احساس ہے زندگی کے بارے میں ان کے اپنے تجربات محرومیوں اور ناکامیوں کی ایک طویل داستان بن گئے ہیں جن کا ردِ عمل کہیں اندوہ والم کی صورت میں اور کہیں طنز کی تلخی اور نشتریت لیے ہوئے نمایاں ہوا ہے ایسے میں مظاہر فطرت اور کائنات کا مشاہدہ ان کے دل پہ جداگانہ نقش مرتسم کرتا ہے۔ اس نقش کو وہ الفاظ کا پیرہن دیتے ہیں تو وہ قدرت اور خالقِ حیات پہ طنز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔
بعض قطعات میں مروجہ اخلاقی نظام اور مذہبی تصورات کو بھی ہدف تنقید

بنایا ہے:-

یہ تری تخلیق نافرجام یہ ٹیڑھی زمین
حشر تک ٹیڑھی رہے گی اس میں تو معذور ہے
آ کے سینے سے لگا لیں خالقِ برحق تجھے
جتنے ہم مجبور ہیں اتنا ہی تو مجبور ہے

کاغذی ناؤ تیراتے کی ضرورت کیا تھی
آگ میں پھول اگانے کی ضرورت کیا تھی
جس کے بننے ہی میں مضمر ہوں بگڑنے کے چلن
ایسی دنیا کو بنانے کی ضرورت کیا تھی

دوسروں کو نچا بھی لیتی ہے
ناچ لیتی ہے آپ بھی خاصا
بڑی فن کار ہے حقیقت میں
جیسے دنیا کہیں وہ رقاصہ

طلسمِ گلشن ایجاد بھول ہے کس کی
فسونِ ہستیِ برباد بھول ہے کس کی
یہ زندگی تو ثمر ہے گناہِ آدم کا
نظامِ دہر کی بنیاد بھول ہے کس کی

اک شور بے اماں کہ ترانہ کہیں جسے
اک تشنگی کہ پینا پلانا کہیں جسے
کیا کہیے کس فریب کے مارے ہوئے ہیں ہم
اک ابتری کہ نظم زمانہ کہیں جسے

ہائے یہ حال دل اپنا کہ سکوں ہے نہ خروش
اور یہ رنگ طبیعت کہ مستی ہے نہ ہوش
محض اطلاق ہے دنیا نہ زمیں ہے نہ فلک
وقت اک لمحۂ ساکت ہے نہ فردا ہے نہ دوش

افلاک کی گردش ہے اک افسانۂ بے رنگ
تقدیر ہے اک زمزمۂ خارج از آہنگ
انسان کے اس عزم جواں سال کے صدقے
اب جس کے بدن پر ہے مشیت کی قبا تنگ

اسی نے مسخ کیا آدمی کی فطرت کو
اس نے روگ لگایا خلوص نیت کو
جہاں سے نیکی بے لوث اٹھ گئی یا رب
اٹھا کے پھینک دے دوزخ میں اپنی جنت کو

حیات وکائنات کے بارے میں ان احساسات کے ساتھ وہ خود کو اس دنیا میں اجنبی سا محسوس کرتے ہیں۔ یہ اجنبیت ALIENATION ترقی یافتہ ٹکنالوجی سے آلودہ جدید تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے۔

اپنا سکا جہاں نہ خدا ہی کے ہو سکے
افلاک سے بنی نہ زمینوں ہی سے پٹی
دنیا میں روح کو نہ ملا کوئی ہم وطن
اپنی تو ساری عمر ہی پردیس میں کٹی

ان تجربات واحساسات کے ساتھ اختر انصاری کی شاعری میں ایک نئے غم کی آواز سنائی دیتی ہے جو نہ تو غم عشق ہے اور نہ غم روزگار۔ یہ غم ہستی ہے جو نوع انسانی کا مقدر ہے اور جسے باشعور اور حساس شخصیتیں ہی محسوس کرتی ہیں۔

وہ بحر کرب والم کا خلاصہ ہے یکسر
نچوڑ ہے وہ تپش کی ابلتی ندیوں کا
مرے وجود کو جس درد نے تراشا ہے
وہ درد راز ہے لاکھوں سسکتی صدیوں کا

سینے وہ درد دل کے کانوں سے
جو نہاں شعر انبساط میں ہے
چشم بینا سے دیکھیے وہ غم
جو مرے لہجۂ نشاط میں ہے

خاک کے ذروں میں جذب و شوق و مستی دفن ہے
مرقدوں میں حسرتوں کی چیرہ دستی دفن ہے
حشر کا دن آہ کس کا حشر ہوگا اے خدا
اس زمین کے بطن میں تو سوز ہستی دفن ہے

اختر انصاری کی غزل گوئی

اختر انصاری نے قطعات کے علاوہ غزل، نظم اور رباعی کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "نغمۂ روح" میں ۳۱ غزلیں شامل تھیں۔ دوسرا مجموعۂ کلام "خونِ ناب" صرف غزلوں پر مشتمل ہے اس مجموعہ میں ۶۱ غزلیں ہیں۔ بعد ازاں چھتیس غزلوں پر مشتمل ایک اور مجموعہ "سرو د جاں" کے نام سے شائع ہوا۔ اختر انصاری کی غزل گوئی کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان کی غزل کے بارے میں مختلف نقادوں کی آرا پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ "نغمۂ روح" پر تبصرہ کرتے ہوئے میرزا ادیب نے لکھا تھا۔

"آپ (اختر انصاری) ایک حقیقی شاعر ہیں۔ حقیقی معنوں میں حقیقی شاعر! سوز و گداز جو "نغمۂ روح" کے ایک ایک شعر میں ہے وہ بعض حضرات کے ضخیم دیوانوں میں بھی نہیں ......

شاعری کی سب سے بڑی خوبی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے
کہ شعر خود بہ خود دل میں اتر جائیں۔ جناب اختر انصاری میں یہ خوبی
بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نغمۂ روح کا ہر شعر درد کی ایک لہر بن کر دل
و دماغ کو سوز و گداز کی کیفیت میں غرق کرتا ہوا روح کی آخری
گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور انسان خود کو اس مادّی دنیا کی الجھنوں
سے دور زندگی کی روح گداز کشمکش سے علیحدہ اور دنیاوی
لذائذ و حقائق سے الگ ایک ایسے عالم میں پاتا ہے جس کی
فضاؤں روحانی مسرتوں کی کیفیتیں تیر رہی ہوتی ہیں۔" ۱

جعفر علی خان اثر نے بھی اس مجموعے کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے غزلوں کے بارے
بارے میں اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی:۔

"اختر صاحب ذوقِ سلیم کی رہبری میں غزل کے لئے نہایت نرم و
نازک زبان اور لطیف جذبات اختیار کئے ہیں پھر بھی علوئے
تخیل سے بیگانگی نہیں برتی اور انداز بیان میں تازگی و ندرت
قائم رکھی ہے ۲

مسعود احمد قریشی نے روحِ عصر کی اشاعت کے بعد اختر انصاری کی شاعری پر ایک
مضمون قلمبند کیا جس میں ان کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار
ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"اختر کے ہاتھ میں غزل بھی ایک انقلابی صنف سخن بن گئی۔

---

۱ ۔ ادب لطیف (افسانہ نمبر) لاہور ۔ ۱۹۳۶ء

۲ ۔ "نغمۂ روح" پر ایک نظر" ادب لطیف (لاہور۔ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء)

اس کی غزلوں میں فیض اور فراق کی کچھ "غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں" والی دورنگی نہیں۔ غزل اب اس کے لئے تھکے ماندے منفرد احساسات نازک مریضانہ جذبات اور ماضی پرستی کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں بھی ایک تند توانائی ہے۔ دیپک سی لپک جس سے وہ فراری ذہنیت اور تلخ حقائق کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے اب یہ گھر کا بھیدی غزل مضامین کی لنکا پر حملہ آور ہے ان قدروں کے چہرے سے جو اس ارتقائی عمل میں پیچھے رہ گئی ہیں اور اب اپنی بے وقت کی راگنی کو روایت اور تقدس کے حسین کفن پہنائے ہوئے ہیں تاکہ عوام کی ہمدردی کو ماضی پرستی کے ذریعہ حاصل کر سکیں۔ اختر تقدس کا نقاب اتار پھینکتا ہے اور حسین نقاب میں پنہاں بنیادی بدصورتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مردہ امیدوں اور کچلی ہوئی تمناؤں کو دفنا چکا ہے اب اسے عالم گیر ظلم اور عالم گیر جنگ نجات کے حضور اپنا ذاتی غم اور تسکین بے معنی نظر آتی ہیں۔ وہ رومانوی احمقوں پر ہنستا ہے۔

اختر کی اس دور کی غزلوں میں لوچ بھی ہے اور لچک بھی لیکن یہ فولاد کی لوچ اور لچک ہے۔ اس کی غزلوں میں اب ایک ٹھیرے ہوئے تالاب کے سکون اور ہلکی ہلکی لرزشوں کے بجائے ایک تیز پہاڑی ندی کا زور اور ابھار ہے اب وہ ماضی کے تصور سے نڈھال ہونے کے بجائے اسے حکم دے سکتا ہے۔"[1]

---

[1] "اختر انصاری پر ایک نظر" ادبی دنیا (لاہور۔ فروری ۱۹۴۶ء)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اختر انصاری کی غزل گوئی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"ان کی غزل گوئی ہماری مروجہ عشقیہ شاعری سے ہٹ کر اپنے اندر بعض نئے احساسات رکھتی ہے جن میں ادبی روایت اور طرزِ بیان کی سجاوٹ کے بجائے ایک طرح کی رومانوی افسردگی اور آرزومندی ملتی ہے" ۱

نظیر صدیقی نے بھی ایک مضمون میں اختر انصاری کی غزلیہ شاعری کے بعض امتیازی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔

"(اختر انصاری) کی غزلیں اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ وہ اُردو غزل کے رسمی عناصر سے پاک ہیں ان کے یہاں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں کسی سچے جذبے یا حقیقی تجربے کی عکاسی نہ کی گئی ہو۔ اس خوبی یا خصوصیت کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اختر انصاری نے رسمی عناصر سے پاک غزلیں اس دور میں کہیں جب غزل کا بڑے سے بڑا شاعر رسمی عناصر کے بغیر اپنی غزل مکمل نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے باوجود آج اگر لوگوں کو اختر انصاری کی غزلیں یاد نہیں ہیں تو اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا موضوع ناکام محبت، جوانی کا ماتم تھا جس کی فرصت زمانے کو میسّر نہیں رہی" ۲

ان مختلف رائیوں اور تبصروں سے اختر انصاری کی غزلیہ شاعری کی نوعیت اور

---

۱ ۔ "اُردو شعر و ادب میں علی گڈھ کا حصہ"، زاویۂ نگاہ (گیا۔ ۱۹۶۶ء)

۲ ۔ "جدید غزل۔ پاکستان اور ہندوستان میں" فنون (لاہور جدید غزل نمبر ۱۹۶۹ء

اہمیت کا کس قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ نظیر صدیقی نے جس بات کو خاص طور پر سراہا ہے وہ یہ ہے کہ اختر انصاری نے اپنی غزلوں میں رسمی عناصر سے احتراز کیا۔ اختر انصاری نے جس زمانے میں غزل گوئی کے میدان میں قدم رکھا حسرت، اصغر، فانی، یگانہ اور جگر جیسے شعرائے اردو غزل کو حیات نو بخش کر اسے فن کی نئی رفعتوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان شعرا نے ان فرسودہ روایتی عناصر سے غزل کو پاک و صاف کیا۔ جن کی وجہ سے یہ صنف مورد الزام بنی ہوئی تھی اس کے باوجود جیسا کہ نظیر صدیقی نے لکھا ہے ان کی غزلیں بھی رسمی عناصر سے پوری طرح مبرا نہیں تھیں، ایسے دور میں اختر انصاری نے اپنی غزلیہ شاعری کی بنیاد حقیقی واردات اور جذبات پر رکھی اور اس طرح اصلاح غزل کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم حصہ لیا۔ حالی نے غزل کو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے ان رسمی عناصر کا تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔

"شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور بندھتے بندھتے بمنزلہ اصول مسلّمہ کے ہو گئے ہیں انہیں کو ہمیشہ بہ ادنیٰ تغیر باندھتا رہے اور ان سے سر مو تجاوز نہ کرے۔ مثلاً غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا، بے مروّت، بے مہر، بے رحم ظالم، قاتل، صیاد، ہرجائی، اپنوں سے نفرت کرنے والا، اور دل سے ملنے والا، سچی محبت پر یقین نہ لانے والا، اہل ہوس کو عاشق صادق جاننے والا، بدگمان بدخو، بدزبان، بدچلن غرضکہ ایک حسن و جمال یا ناز و ادا و دیگر حرکات مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہے اور اپنے تئیں غمزدہ مصیبت زدہ، فلک زدہ، ضعیف، بیمار، بدبخت، آوارہ، بدنام

مردود، خلایق، آوارگی پسند، بدنامی کا خواہاں، حسن قبول سے نفور خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنے والا، مئے خوار، بدمست، مدہوش خود فراموش، وفادار، جفاکش، کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزومند، کہیں صابر اور کہیں بے قرار، کہیں دیوانہ اور کہیں ہوشیار، کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا، رشک کا پتلا، رقیبوں کا دشمن سارے جہاں سے بدگماں، آسمان کا شاکی، زمین سے نالاں، زمانے کے ہاتھ سے تنگ۔ غرض کہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں ان تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کے لئے قابل افسوس خیال کی جاتی ہیں یا مثلاً آسمان اور زمانہ یا عصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا یا زاہد واعظ و صوفی کو لتاڑنا اور بادہ کش و بادہ فروش اور ساقی و خمار کی تعریف کرتی اور ان سے حسن عقیدت ظاہر کرنا۔ ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرتی۔ کبھی کبھی مال و جاہ و منصب دنیوی کو حقیر ٹھیرانا اور فقر و عشق و آزادگی وغیرہ کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسی طرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کے لئے بمنزل ارکان دعناصر کے ہو گئے ہیں۔ غزل کے ساتھ جو مخصوص ہیں وہ بھی ایک نہایت تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ مثلاً معشوق کی صورت کو حور، پری، چاند، سورج، گل لالہ، باغ اور جنت وغیرہ سے اس کی آنکھ کو نرگس، آہو، بادام، ساحر، مست، بیمار وغیرہ سے زلف کو سنبل سے مشک، عنبر، کافور، جادوگر، رات، ظلمات، دام

زنجیر، کمند وغیرہ سے نگاہ و مژہ وغیرہ و، ناوک، تیر و سنان و شمشیر وغیرہ سے ابرو کو کمان سے ذقن کو کنویں سے، دانتوں کو موتیوں سے، ہونٹوں کو لعل، یاقوت، گلبرگ، نبات، آب حیات وغیرہ سے، منہ کو غنچہ سے، کمر کو بال سے، یا دونوں کو عدم سے، قد کو سرو و صنوبر شمشاد، قیامت وغیرہ سے، رفتار کو فتنہ، قیامت، بلا، آفت، آشوب وغیرہ سے اور اسی طرح اور بعض اعضاء کو چند خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا معشوق کے سامان آرائش میں سے مشاطہ، شانہ، آئینہ، حِنا، سرمہ، کاجل، غازہ، مسّی، پان کبھی قبا، بند قبا، کلاہ، چیرہ، دستار اور کبھی برقع، نقاب، محرم چادر، چوٹی، چوڑیاں، اور خاص خاص زیوروں کا ذکر کرنا اور ان کو خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا۔" [1]

جیسا کہ نظیر صدیقی نے کہا ہے کہ جدید دور کے اساتذہ غزل بھی ان رسمی مضامین سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکے ذیل کے اشعار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:-

مری مجبوریاں مشق جفا سے باز رکھیں گی
ترا شوق ستم ظالم خیال امتحاں تک ہے

(حسرت)

مائل غمزہ ہے وہ چشم سیاہ
اب نہیں خیر پارسائی کی

(حسرت)

---

[1] - مقدمہ شعر و شاعری (ص-۷۹-۸۱)

گلے سے تیغ ادا کو جدا نہ کر قاتل
ابھی یہ منظر راز و نیاز رہنے دے
(جگر)

خوب تھا صحرا برائے ذوق جنون
پھاڑنے کو ست نئے دامن کہاں
(اصغر گونڈوی)

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی
(فانی)

اس میں شک نہیں کہ ایسے اشعار کا تناسب ان اساتذہ کے کلام میں بہت کم ہے پھر اسیت کے باوجود یہ اشعار اصلیت سے عاری نہیں ہیں لیکن اس دور کے دوسرے غزل گو شعرائ کا کلام دیکھ جائیے تو ہر غزل میں رسمی مضامین کی بھرمار ملے گی۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ اختر انصاری کی شاعری رسمی مضامین سے پوری طرح محفوظ و پاک ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی غزلوں میں رسمی مضامین کہیں کہیں تلاش کے بعد ہی مل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں جہاں جذبات کی تازگی محسوس ہوتی ہے وہیں ان کے اظہار کا پیرایہ بھی دوسرے غزل گو شاعروں سے مختلف نظر آتا ہے۔

مسعود احمد قریشی نے اختر انصاری کی ایک غزل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ غزل ایسے مقام پر جہاں نظم و غزل کی مصنوعی سرحدیں ختم ہو کر صرف ادبیت حرف شعر باقی رہ جاتا ہے۔ یہ خصوصیت کم و بیش ان کی تمام غزلوں میں پائی جاتی ہے اختر انصاری نے غزلیں بھی اسی طرح کہی ہیں جس انداز میں

انھوں نے قطعات اور نظمیں لکھی ہیں۔ قطعوں اور نظموں کی طرح غزل میں بھی وہ جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے جذبات کو بیان کرتے ہیں۔ میرؔ وسوداؔ سے پہلے دکنی غزل میں اور پھر غدر سے پہلے شعرائے لکھنؤ کی غزل گوئی کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اخترؔ انصاری اپنے جذبات اور خیالات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ حذف وایما سے کام نہیں لیتے جو غزل کے فن کا لازمہ بن چکا تھا ان کے واضح بیانیہ اسلوب کی وجہ سے اشعار غزل میں معانی آفرینی بھی نہیں پائی جاتی۔ اکثر شعر مفہوم کے اعتبار سے اکہرے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

غمِ حیات کہانی ہے، قصہ خواں ہوں میں
دلِ ستم زدہ ہے راز، راز داں ہوں میں

میں دل کو چیر کے رکھ دوں یہ ایک صورت ہے
بیاں تو ہو نہیں سکتا جو اپنی حالت ہے
محبت ہے، اذیت ہے، ہجوم یاس وحسرت ہے
جوانی اور اتنی دکھ بھری کیسی قیامت ہے

محبت کی سوزش سے خالی ہے سینہ
یہ جینا بھی ہے کوئی جینے میں جینا

فلک سے رات کو جب چاندنی برسائی جاتی ہے
ہماری بزم میں اشکوں کی مئے چھلکائی جاتی ہے

— — — — — —

اختر انصاری کا یہ بیانیہ اسلوب غزل کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ ان کی اس شاعری میں سپاٹ پن محسوس ہوتا ہے۔ البتہ جہاں انہوں نے تشبیہہ کے پیرائے میں اظہار جذبات کیا ہے۔ تخیل اور محاکات کی کارفرمائی کی وجہ سے دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ تشبیہہ نگاری کی وہ خصوصیات جو ان کے قطعوں میں ہم دیکھ چکے ہیں غزل میں بھی نکھر کر سامنے آئی ہیں۔ اختر انصاری پامال تشبیہوں سے بالعموم گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر مخصوص کیفیات اور جذبات کے اظہار کے لئے نئی تشبیہیں اختراع کرتے ہیں اکثر تشبیہوں سے ان کے مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

کیا یاد کر کے عشرتِ رفتہ کو روئیے
اک لہر تھی جو ناچ گاتی چلی گئی

عشرت رفتہ کی تشبیہہ لہر سے دے کر نہ صرف یہ دکھایا ہے کہ عیش و آرام کا زمانہ اب ایسا خواب بن گیا ہے جو نہ صرف یہ کہ تعبیر سے محروم رہا بلکہ اب وہ خواب بھی دوبارہ شاید نظر نہ آئے۔

اب کوئی دم میں غرق ہوا چاہتا ہوں
جو موجِ آب پہ ہو رواں وہ دیا ہوں میں

شاعروں نے عارضی زندگی کو حباب، پھول کی ہنسی اور ایسے ہی ناپائیدار مظاہر سے تشبیہہ دی ہے۔ اس شعر میں جو تشبیہہ دی گئی ہے بالکل نئی ہے شاعر نے یہاں عمومی انداز میں زندگی کی بے ثباتی کو نہیں بلکہ خود اپنے قریب المرگ ہونے کے احساس کو پیش کیا ہے۔ تشبیہات کی مدد سے مختلف کیفیات کی تصویر کھینچنے میں بھی انہیں کمال حاصل ہے :-

آہ مطرب یہ ترا دھیمے سروں میں گانا
جیسے دریا شبِ مہتاب میں آہستہ بہے

اُف رے وہ نزاکت لہجے کی باتیں جو نکلتی ہیں منہ سے
یا چاند کی کرنیں ہوتی ہیں یا برف کے گالے ہوتے ہیں

صبا کچھ ایسی مرے گوشِ دل میں آتی ہے
کوئی بنائے دلہن جیسے لڑکھڑاتی ہے

یہ شاعری نہیں ہے تمنا کی قبر پہ
تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

اختر انصاری اپنی اختراع کردہ تشبیہوں میں بالعموم مشبہ بہ کو مخصوص کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تشبیہوں میں ندرت پیدا ہو گئی ہے :-

ناز فرما ہے تمنائے جواں یوں دل میں
جیسے دوشیزہ کوئی صحن چمن میں ٹہلے

نغمہ اس طرح میرے دل پہ اثر کرتا ہے
جیسے ذرّات میں خورشید گذر کرتا ہے

غم زدہ ہیں مبتلائے درد ہیں ناشاد ہیں
ہم کسی افسانۂ غم ناک کے افراد ہیں

یہی اوصاف ان کے تشبیہی مرکبات میں بھی پائے جاتے ہیں جن سے خاص کیفیات اور جذبات کی ترجمانی کا کام لیا گیا ہے۔

مدتوں کھیلیں ہیں مجھ سے غم کی بے درد انگلیاں
میں رباب زندگی کا اک شکستہ تار ہوں

ہم تھے عشرت کی گہری نیندیں تھیں
آئے آلام اور جھنجھوڑ گئے

زندگی کی موسیقی کس ستم کی شاکی ہے
حزن ہے نوا دن میں لے میں ہے چٹیلا پن

بے حسی کی نرم و نازک چھاؤں تھی حلہ حیات
پھٹ پڑا احساس کا آتش فشاں مارے گئے

رخ سیم رنگ کی چاندنی کبھی اک جھلک جو دکھا گئی
میرے دل کا درد ٹھہر گیا میرے غم کو نیند سی آ گئی

نہیں وہ اگلی سی رعنائیاں خیالوں میں
تصوّرات کی زلفوں میں پیچ و خم نہ رہا

اختر انصاری نے تشخص و تجسم کے ذریعہ بھی استعارہ سازی کی ہے ان کی شاعری میں یہ استعارے بالعموم مختلف کیفیات و جذبات کے پیکر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کسی کے عیشِ تمنا کی داستاں نہ کہو
کلیجہ میری تمناؤں کا دھڑکتا ہے

نامرادی سے کہو ... اپنا
میری دنیا میں عروس ... آئی

گردشِ افلاک کے ہاتھوں بہت برباد ہیں
ہم لبِ ایام پہ اک دکھ بھری فریاد ہیں

شرابِ حسن میں ڈوبی ہوئی نگاہوں نے
مجھے خرید لیا التفات کے بدلے

وہ کیفیت ارے توبہ کہ وحشیوں کی طرح
دلِ ستم زدہ سینے میں سر پٹکتا ہے

اختر انصاری کی غزلوں کے اشعار میں عام طور پر بیان کی سادگی و صراحت ملتی ہے۔ لیکن جہاں انھوں نے ایما و اشارے سے کام لیا ہے ان کے اشعار کے لطف و تاثیر میں یک گونہ اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ ہوا یہ برگِ گل کا اہتزاز
آج میں رازِ مسرت پا گیا

مٹ گئے وہ نظارہ ہائے جمیل
لیکن آنکھوں میں عکس چھوڑ گئے

کہانی جور و جفا کی سنی ہے ہنس ہنس کر
وفا کا ذکر جب آیا ہے رو دیا ہوں میں

مرے پڑوس میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

کون ہے بے قرار میرے لیے
آج کچھ بے قرار سا ہوں میں

اجڑ کے پھر نہیں بستا جہاں دل اختر
بہار باغ کو اس پہ دلیل لاؤ نہیں

صنائع کا استعمال شعر میں لفظی و معنوی محاسن پیدا کرتا ہے۔ بشرطیکہ محض صناعت ہی شاعری کا مقصد بن کر نہ رہ جائے۔ صنعتوں کا استعمال ہر اچھے اور برے شاعر کے کلام میں مل جاتا ہے۔ اردو کی غزلیہ شاعری میں صنعت نگاری اس التزام کے ساتھ ہوئی ہے کہ وہ غزل کے فن کا لازمہ بن گئی ہے۔ اختر انصاری کے کلام بالخصوص غزلوں میں کم و بیش تمام رائج اور معروف صنعتیں مل جاتی ہیں۔ بعض صنعتیں انھیں زیادہ مرغوب ہیں انھیں میں ایک صنعت تضاد بھی ہے۔ صنعت تضاد کا استعمال اشعار ذیل میں ملاحظہ ہو۔

چھپا ہے حسنِ بہاراں خزاں کی زردی میں
رخِ بہار میں رنگِ خزاں جھلکتا ہے

امید بر نہ آئے تو چھا جائے یاس ہی
اب دل یہ چاہتا ہے کسی طرح کل پڑے

وہ میرے قلب کی تسکین وہ تڑپ نہ رہی
وہ میری روح کی ٹھنڈک وہ سوزِ غم نہ رہا

خوشی کی جس نے کبھی شکل تک نہ دیکھی ہو
الم کی قدر وہ کیا خاک جان سکتا ہے

"پست" کہتا نہیں میں پستی کو
اپنی فطرت بلند رکھتا ہوں

میں ہنستا ہوں دن بھر میں روتا ہوں شب بھر
خدا جانے مجھ کو یہ کیا ہو گیا ہے

ایک صنعت جو قلب کہلاتی ہے اختر انصاری نے کس قدر تبدیلی کے ساتھ استعمال کی ہے۔ صنعت قلب میں کسی مصرع یا مصرع کے جز کو الٹ دیا جاتا ہے۔ اختر انصاری نے اکثر اشعار میں دو لفظ مکرر اس طرح لائے ہیں کہ پہلے مصرع میں جو لفظ پہلے آیا ہے دوسرے مصرعے میں ترتیب الٹ کر اسے بعد میں لایا گیا ہے۔ تقلیب کا یہ عمل کہیں صنعت تضاد کے ساتھ کہیں رد العجز علی الصدر اور کہیں قطار البعیر کے سلسلے میں ملتا ہے مثلاً

خزاں یہ کہتی تھی میں شوخئ بہاراں ہوں
بہار کہتی ہے رنگینئ خزاں ہوں میں

ہائے کیا کھیل کھیلا ناگہاں مارے گئے
ناگہاں مارے گئے اور پھر جوان مارے گئے

اختر انصاری کے اسلوب میں ایک میلان تکرار الفاظ اور تکرار اصوات کا ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی صنعیں انھوں نے زیادہ استعمال کی ہیں

جن کے نتیجہ میں الفاظ اور اصوات کی تکرار واقع ہوتی ہے۔ ذیل میں چند
ایسی ہی صنعتوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں :۔

تکریر

یہاں کے گوشے گوشے سے برستی ہے مئے عشرت
تصوّر کی فضا خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

زمیں زمیں نہ رہے اور فلک فلک نہ رہے
انوکھے حشر اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

خواب میں دیکھتا ہے کوئی مجھے
سوتے سوتے جو چونک اٹھا ہوں

میرے ساقی کی مست آنکھوں سے
گر رہی ہے شراب چھن چھن کے

دل و دماغ ہے معمور تیرے ارماں سے
نفس نفس میں ہے آباد آرزو تیری

چاندنی چاندنی نہیں اختر
رات کی گود میں سویرا ہے

تکریر مع الوسائط

بڑھ کے ٹکرائے گئے کلیوں کی طرح
جام سے جام سمجھتے کیسا ہو

جو سچ پوچھو تو دنیا میں فقط رونا ہی رونا ہے
جسے ہم زندگی کہتے ہیں کانٹوں کا بچھونا ہے

اے دل اپنی متاع سے ہشیار
اب کے نظروں سے نظریں لڑتی ہیں

کس حسین اسلوب سے کیسی دل آسائی کے ساتھ
پردے ہی پردے میں بے تیر و سنان مارے گئے

سہ حرفی صنعت

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

گردشِ وقت لے نہ ڈوبے کہیں
گردشِ جام اور تیز کرو

اب نکتہ سنجیوں سے میں بیزار ہو گیا
اب جو چلے خیال کے دل سے اتر گئے

چشمِ باطن سے دیکھتا ہوں میں
چشمِ ظاہر کو بند رکھتا ہوں

جوانی زندگی کی عشرت آگیں رات ہے گویا
جوانی میں محبت کا چھلکتا جام ملتا ہے

سازش وقت کا تقاضا ہے
سازش کام سوچتے کیا ہو

عشق روحِ زندگی روحِ جوانی ہے مگر
عشق کی روحِ رواں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

کبھی دلوں کو غم و اذیت کے تذکروں سے رُلا رہا ہوں
کبھی دماغوں کو عیش و عشرت کے قصے کہکر سلا رہا ہوں

اشتقاق

وہ میرا تبسم شگفتہ رو وہ کسی کے ناز شگفتہ خو
یہ شگفتگی بھی عجیب تھی کہ ہنسا ہنسا کے رلا گئی

بندگی سے دل اس طرح ہے نفور
جیسے بندہ نہیں خدا ہوں میں

یوں تو جیئے ساری عمر لیکن
جینے کی طرح نہ جی سکے ہم

ردلعجز علی اصدر

اور اس سے مشابہ تکرار

ہائے کیسا کھیل کھیلا ناگہاں مارے گئے
ناگہاں مارے گئے اور بھرجواں مارے گئے

دل اگر ہے تو ہے غم دل بھی
غم دل سے پناہ ناممکن!

ہو کے محروم تمنا جو جیئے گا یارب
اس کا جینا بھی کوئی جینے میں جینا ہوگا

ان کے علاوہ دیگر صنعتوں، رعایت لفظی، حسن تعلیل، جمع وغیرہ سے اختر انصاری نے نہ صرف ظاہری آرائش کا کام لیا ہے بلکہ ان سے معنی آفرینی اور غنائیت پیدا کرنے میں بھی مدد لی ہے۔

رعایت لفظی

ہمارے سر سے کبھی کا گزر گیا پانی
برس بہار کی سرشار رات خوب برس

حسن تعلیل

یہ شبنم ہے اختر کہ فرطِ حیا سے
جھلکتا ہے گل کی جبیں پر پسینہ ؟

کس کے حسنِ سیمیں کا یہ شاید اک بھکاری ہے
زمیں پہ چاند نے پھیلا دیا ہے اپنے داماں کو

جمع

حسرتیں سردِ آہیں گرم آنسو
لائی ہے برشگال سو نعمتیں

حلقۂ دام وفا عقدۂ غم موجِ نشاط
یہ زمانہ بھی دکھاتا ہے چم و خم کیا کیا

پئے نظارۂ گل کون جائے گلشن تک
حیات روز شگوفے نئے کھلاتی ہے

شراب خانۂ ہستی کی ابتری افسوس
شعور بادہ گساری پہ حرف آتا ہے

مشکل زمینوں میں طبع آزمائی

اختر انصاری کو فن شعر پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی فن دانی کا شعوری طور پر اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی وہ غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں جو انھوں نے مشکل زمینوں میں کہی ہیں ان میں سے بعض زمینیں خود ان کی اختراع کی ہوئی ہیں۔ بعض غزلوں میں ایسی طویل ردیفیں لائی گئی ہیں کہ ان کو نباہتے ہوئے اچھے شعر نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اختر انصاری نے طویل ردیفوں والی زمینوں میں بھی لمبی غزلیں کہی ہیں۔ اور بعض عمدہ شعر نکالے ہیں۔

ذیل میں طویل ردیفوں والی چند غزلوں سے ایک ایک مصرع درج کیا جاتا ہے ان سے اندازہ ہو گا کہ زبان و بیان پر قدرت رکھنے والا شاعر ہی ایسی زمینوں میں طبع آزمائی کر سکتا ہے:۔

۱۔ کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
قافیہ ردیف

۲۔ نظر کی صاعقہ باری پہ حرف آتا ہے
قافیہ ردیف

۳۔ گریہ عادت ہے پونچھتے کیا ہو

قافیہ ردیف

۴۔ خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن میں

قافیہ ردیف

۵۔ وفور شوق کی بنیاد آرزو تیری

قافیہ ردیف

بعض غزلوں میں ایسی ردیفیں لائی گئی ہیں جن کو قوافی کے ساتھ جوڑ کر کوئی مضمون پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے مثلاً

۱۔ مہربان مارے گئے نامہربان مارے گئے

۲۔ آرزو کے جنون خام کی بات

قافیہ ردیف

بعض غزلوں میں ردیفیں تو مختصر لائی گئی ہیں لیکن قوافی سے منسلک ہوکر زمین ادق ہوجاتی ہے۔ ان میں سے بعض زمینوں میں قوافی مشکل لائے گئے ہیں۔

۱۔ ہے یاس میں نمایاں امید کی جھلک بھی

قافیہ ردیف

۲۔ ہتھیلیوں سے ابھی آنکھیں مل رہی ہے سحر

قافیہ ردیف

۳۔ طبع عشرت پسند رکھتا ہوں

قافیہ ردیف

۴۔ دل حزیں کا ہے بے حد حسیں سہارا درد

قافیہ ردیف

۵۔ قسم ان آنکھوں کی جن سے ہو ٹپکتا ہے

قافیہ ردیف

۶۔ آرزو کے جنون خام کی آگ

قافیہ ردیف

بعض غیر مردّف غزلوں میں قوافی ایسے لائے گئے ہیں کہ جن میں ہم قافیہ الفاظ بظاہر کم ملتے ہیں لیکن اخترؔ انصاری نے تلاش سے ہم قافیہ الفاظ فراہم کیے ہیں اور بعض صورتوں میں قوافی تراشے بھی ہیں مثلاً

۱۔ راگنی دل کی بہت گائی گئی ہے پہلے
تاہم اخترؔ جو تجھے کہنا ہو تو بھی کہہ لے

۲۔ یہ حسین فطرت کے حسن کا انیلاپن
زندگی کے عارض پر یہ کریہہ پیلاپن

اس غزل میں مزید قافیے باندھے گئے ہیں۔ کٹیلا، رسیلاپن، ہٹیلاپن چٹیلاپن، سریلاپن، نشیلاپن اور نکیلاپن۔

محاورہ بندی

جدید دور کے غزل گو شاعروں نے محاوروں کی طرف کم التفات کیا ہے۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف نثر و نظم میں بھی بالعموم یہی صورت

زبان استعمال کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شعر و ادب کی زبان محاورے کے لطف سے محروم ہو گئی ہے۔ اختر انصاری نے اکثر با محاورہ زبان استعمال کی ہے اور محاوروں سے لطف سخن بڑھانے میں خاطر خواہ مدد لی ہے۔ اختر انصاری کی غزل میں محاورہ بندی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو داغ بن کے تمنا تمام ہو جائے
ہمیں تو خون بھی ناجرام ہو جائے

جب سے منہ کو لگ گئی اختر محبت کی شراب
بے پیئے آٹھوں پہر مدہوش رہنا آ گیا

بلبل ترے نثار اس انداز سے چہک
فصل بہار کا بھی کلیجہ اچھل پڑے

اُمید بر نہ آئے تو چھا جائے یاس ہی
اب دل یہ چاہتا ہے کسی طرح کل پڑے

وہ کیفیت ارے توبہ کہ وحشیوں کی طرح
دل ستم زدہ سینے میں سر پٹکتا ہے

دل کے ارمان دل کو چھوڑ گئے
آہ منہ اس جہاں سے موڑ گئے

نالے کو بھی آہ کو بھی روکا
ہاں یہ ہے کہ لب نہ سی سکے ہم

اختر اخفائے تمنا کی ہے کوشش بے سود
یہ محبت کبھی پردے میں رہی ہے نہ رہے

بنا کے فکر و تردد کو خادم انسان
مقدرات کے چھکے چھڑا دیئے ہم نے

طلسم توڑ کے جھوٹی عقیدتوں کے تمام
عجائبات کے جادو جگا دیئے ہم نے

خیال عمر گذشتہ ذرا توقف کر
زمین قدموں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے

اختر انصاری کی نظم نگاری و مثنوی

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اختر انصاری کو قطعہ نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے دوسری اصناف سخن بالخصوص نظم کی صنف میں انھوں نے جو اعلیٰ پایہ کی تخلیقات پیش کیں انھیں ان کی خاطر خواہ داد نہیں مل سکی۔ جدید اُردو نظم کو ترقی دینے میں انھوں نے جو حصّہ لیا ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ اختر انصاری کے قطعات دراصل مختصر نظمیں ہی ہیں جو مخصوص سانچے میں لکھی گئی ہیں۔

اختر انصاری نے جس زمانے میں شعر کہنا شروع کیا اقبال، چکبست رواں اور جوش کی نظم نگاری کے چرچے عام تھے نئے لکھنے والے انھیں کی نظموں کو نمونہ بنا کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ اختر انصاری نے ابتدا میں انھیں شعرا کا تتبع کیا۔ ابتدائی دور کی نظموں میں قطب مینا، آبِ رواں، سیرِ کہسار، دل کی دنیا، ہلالِ عید، شام، قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں کا اسلوب

اقبال کی بانگ درا (حصۂ اول) اور جوش کی نظموں کا سا ہے کس منظر فطرت کا تشخص کرتے ہوئے اپنا مخاطب بنا کر اظہار جذبات کا انداز اقبال اور جوش کرتے ہوئے اپنا مخاطب بنا کر اظہار جذبات کا انداز اقبال اور جوش سے ماخوذ ہے چنانچہ نظم سیر کہسار کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

یہ ترا وجود آفرین جوش بہاران اے بہار
یہ ہجوم سبزہ وگل یہ ہوا ے نشۂ بہار

اسی طرح نظم "آبِ رواں" میں خود آبِ رواں کو مخاطب بناتے ہیں۔

فکر میں ڈوبا ہوا پھرتا ہے صبح و شام تو
جھیلتا ہے کیسے کیسے رنج اور آلام تو

اختر انصاری کی یہ ابتدائی نظمیں رومانوی آہنگ کے ساتھ ان کے رومانوی خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں ان کی رومانویت ایک عاشقانہ ترنگ ہے جس میں کلاسیکیت، عقلیت پسندی یا میکانیت کے خلاف کسی ردعمل کا اظہار نہیں ملتا۔ ان کی رومانیت میں جو چیز سب سے زیادہ ممتاز نظر آتی ہے وہ ان کا داخلی انداز نظر ہے لیکن اس داخلی انداز نظر کے باوجود انھوں نے عشق مجازی کی واردات اور معاملات سے زیادہ مناظر فطرت اور فنون لطیفہ سے پیدا ہونے والی کیفیات کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ غزلوں اور قطعات کی طرح نظموں میں بھی ان کے لہجے میں ایک خاص طرح کی غنائیت ملتی ہے جو تکرار الفاظ اندرونی قوافی اور اصوات کی تنظیم سے تشکیل پاتی ہے۔ کبھی مکرر الفاظ، گنبد کی صدائے بازگشت کی طرح بار بار یہ دہ سماعت سے ٹکراتے اور تحت شعور کے خوابیدہ خیالات اور احساسات کو جگاتے ہیں مثال کے طور پر نظم "سیر کہسار" کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:۔

یہ ترا وجد آفریں جوشِ فراوان اے بہار
یہ ہجوم سبزہ و گل یہ ہوائے نشہ بار

یہ تری رعنائیاں کہسار کے آغوش میں
اب دلِ شوریدہ کا مشکل ہے رہنا ہوش میں

ہر طرف حدِ نظر تک اک صفِ کہسار ہے
دور اونچی چوٹیوں پہ برف کا انبار ہے

کوہ پر شبنم کا ہر قطرہ دُرِ نایاب ہے
اور دُرِ نایاب میں کھوتا اک مہتاب ہے

آبشاروں کا نظارہ کیفیت انگیز ہے
قطرہ قطرہ میکدہ موج بادہ ریز ہے

نظم "برسات کے مناظر" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

سرمگیں بادل امنڈ کر آسمان پر چھا گئے
یعنی اعلان ہو گیا "برسات کے دن آ گئے"

گلستاں کے مطربوں کو چہچہانا آ گیا
مرغزاروں کو ہرا ہو لہلہانا آ گیا

کھل کھلاتی آبشاریں اور ابلتی ندیاں
جنگلوں سے آرہی ہیں کارواں در کارواں

ابر کی پیہم تراوش سے زمیں شاداب ہے
قدرتی زیور سے گلشن کی جبیں شاداب ہے

ننھی ننھی کونپلوں سے ڈھک گئے ہیں کوہسار
ہر طرف ہے خوش نما دھانی درختوں کی قطار

بعض نظموں میں ان کا داخلی انداز صرف غمِ ذات پر مرکوز ہو گیا ہے:-

غمِ محبت ناکام دل کو بھاری ہے
مذاقِ درد بھی بیزارِ صبر کاری ہے

سکون نصیب نہیں ہائے بے قراری ہے
عذابِ روح ہمیں آرزو ہماری ہے

کسی کی چاہ اذیت کا نام ہے گویا
ہمارے واسطے جینا حرام ہے گویا

جیسا کہ ہم قطعات کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ آئے ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں رقص اور موسیقی سے اختر انصاری کو بے انتہا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی قطعات لکھے ان کی نظمیں "اودے شنکر" "مغنیہ" اور "لتا منگیشکر" ان کے اس لگاؤ کی عکاسی کرتی ہیں۔ اودے شنکر کے متعلق

کہتے ہیں :-

کسی نغمے کی لے ہے ترا جسم ؟
یا ستاروں کی کانپتی تصویر ؟
کسی صناع کی حسیں صنعت ؟
کسی بت گر کے خواب کی تعبیر ؟
یا مگر اک وجود رومانی ؟
جس کی ہو شعریات سے تعمیر ؟

اختر انصاری کو مغنیہ کے سحر کا نغمہ [illegible] معلوم ہوتی ہے۔

جب دلوں کو سحر زا نغموں سے تڑپاتی ہے تو
جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تو

بزم کو جب راگ کی حدت سے گرماتی ہے تو
غرق ہو کر بحر موسیقی میں جب گاتی ہے تو

گیت کے طوفان میں بہہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

۱۹۴۴ء تک اختر انصاری اسی انداز کی نظمیں لکھتے رہے سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد ان کے نظموں کے اسلوب اور موضوعات میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے مشاہدے اور مطالعے نے زندگی کے دوسرے بے شمار پہلو کی چھوٹی بڑی باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتی ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر نے آنکھوں سے دیکھی ہوئی حقیقتوں میں چھپی ہوئی ایک اور گہری حقیقت کی طرف

مائل کیا اور جذبانیت اور فکر نے اس نئی حقیقت میں فنی رنگ آمیزیاں کیں۔ اب انھوں نے انسانی زندگی کو اپنے خیال اور فکر کا محور بنایا۔ اب وہ ادب کی سماجی افادیت کے قائل ہو گئے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی شاعری میں سیاسی مسائل جگہ پانے لگے۔ ان کی نظموں کے موضوعات بدلنے لگے، آہنگ بدلنے لگا۔ موضوع اور انداز فکر کی اس تبدیلی کا تقاضا تھا کہ اسلوب اور اظہار کے سانچے بھی نئے ہوں۔ ان کی اس تبدیلی سے پیدا ہونے والے نئے لہجے کے متعلق مسعود احمد قریشی نے لکھا کہ :

"وہ اپنا وہی جذباتی وفور اور خلوص لے کر اب ترقی پسندی کی راہ میں برق رفتاری سے چل رہا ہے۔ اس نے رومانی شاعری میں غم عصر کو ایک نیا لہجہ دیا تھا اب روح عصر یعنی مسرت و اعتماد کو ایک نیا ادبی لہجہ دے رہا ہے۔ ایک روایتی انقلاب مزدوروں کی رسمی ہمدردی کو اس نے زندگی کی دھڑکن اور عصر حاضر کی زبان دی . . . ۱"

اختر انصاری کا یہ بدلہ ہوا لہجہ ان کی بعد کی نظموں میں بتدریج تشکیل پاتا رہا۔ اس تبدیلی شدہ لہجے میں ایک طرح کا ضبط، ٹھیراؤ اور خود اعتمادی ملتی ہے۔ اختر انصاری کی شاعری کا یہ دوسرا دور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ۱۹۴۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے کچھ پہلے ان کے تنقیدی مقالے "افادی ادب" کی اشاعت عمل میں آئی اب وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں رہے اور ادب کی سماجی افادیت پر زور دینے لگے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں اپنے

---

۱ ۔ ادبی دنیا لاہور ۱۹۴۶ء "اختر انصاری پر ایک نظر"

نظریہ ادب کی وضاحت کی۔ ادب کی مقصدیت پر اصرار کرتے کے ساتھ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شاعر کو (کسی بھی قیمت پر) تخلیق حسن کے آداب سے رو گردانی نہیں کرنی چاہیے۔ تبھی مسائلی اور سیاسی شاعری کی اپیل دیرپا ہوسکتی ہے
یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں جمہوریت اور قومی آزادی کے خلاف فاسسٹ قوتیں برسرپیکار تھیں اور اس سے امن عالم شدید طور پر متاثر ہوا تھا حساس ذہنوں کا ان حالات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اختر انصاری جیسے رومانی اور داخلیت پسند شاعر نے "فاشزم" پر قلم اٹھایا۔ یہ ایک طنزیہ نظم ہے وہ فاشزم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

"اے دیو استبداد ابھی چند سخت جاں بستیاں ایسی باقی ہیں
جہاں پھول کھلتے ہیں، کلیاں چٹکتی ہیں، زندگی مسکراتی ہے،
بچے ہنستے ہیں، پرندے چہچہاتے ہیں۔ یہ بستیاں ابھی تک خاک
و خون میں غلطاں نہیں ہوئیں، یہاں ابھی آگ و خون کی
ہولی نہیں کھیلی گئی۔ آگے بڑھ اور ان بستیوں کو تہس نہس
کر دے" خاک و خون میں غلطاں کر دے، لوٹ لے، تباہ
کر دے تاراج کر دے۔"

نظم "ہمارا خون" جنگ کے زمانے میں لکھی گئی ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۹۴۴ء ہے ۱۹۳۹ء سے جنگ کے بادل دنیا پر منڈلا رہے تھے۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا فرانس اور انگلستان نے اس کی حمایت میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بھی کئی ملک ایک دوسرے کی مدد کے لیے اس جنگ میں شریک ہوتے گئے۔ بالواسطہ طور پر ہندستان کو بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ برطانوی وائسرائے کا یہ وعدہ تھا کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ہمیں

قدر جلد ممکن ہو گا ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ دیا جائے گا۔ فاشزم کا خطرہ ساری دنیا پر منڈلا رہا تھا۔ یہ جنگ صرف چند ملکوں کی باہمی لڑائی نہ تھی بلکہ دنیا میں جمہوریت اور انسانیت کی بقا کا انحصار اس پر تھا کہ جرمنی کو شکست ہو۔ یہ جنگ انسانی اقدار کے تحفظ کی جنگ تھی یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں نے فاشزم کے خلاف آواز بلند کی۔ جنگ میں فاشزم کو کامیابی ہونے پر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد بے معنی ہو جاتی اس لئے یہ جنگ ہندوستانیوں کے لئے جنگ آزادی کے مترادف تھی چنانچہ وامق جونپوری نے "جنتا کی لڑائی" میں کہا کہ :-

یہ فاشیت کو دنیا سے مٹائیں گے تو دم لیں گے
یہ سامراج کے ایوان کو ڈھائیں گے تو دم لیں گے
یہ نغمے اپنی آزادی کے گائیں گے تو دم لیں گے
یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے

جنگ اور راہ آزادی میں خون بہانا روا سمجھا گیا لیکن اختر انصاری نے "ہمارا خون" میں بالکل ہی نئے انداز میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اس نظم کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ جنگ اور اس کی تباہ کاریاں سب کچھ ہمارے خون کا کھیل ہے :-

یہ تباہی اور ہلاکت کا جنون
یہ شکست و فتح کا مہلک فسوں

یہ مسلح فوجیوں کا طمطراق
یہ بلکتی ماؤں کا سوزِ فراق

آسمان سے موت کی بارش ہیں
رات دن یہ قتل ہی کی سازشیں

یہ حصولِ برتری کے شور سے
اور یہ غارت گری کے مشورے

یہ اچھوتی وضع کے آلاتِ جنگ
یہ تحیر آفریں حالاتِ جنگ

کھیل ہے سارا ہمارے خون کا
ایک نظارہ ہمارے خون کا

نظم کے دوسرے حصے میں وہ کہتے ہیں کہ جنگ سے پہلے کے زمانے کو ہم دورِ امن کہتے ہیں جس میں سکون، تمام راحتیں آسائشیں تھیں۔ جب لوگ بے فکری کے ساتھ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت پہ گفتگو کرتے شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوا کرتیں۔ شہر کے دن میں بہار رہا کرتی، جب تماشا گاہوں کی دل فریبی اور طرب خانوں کی رنگین عشرتوں میں کھوئے رہتے تھے اس دور کے امن میں بھی ہمارا خون ہی شامل تھا۔

اس نظم میں "ہم" کی ضمیر نچلے طبقے کے عوام کے لئے لائی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں انھیں کا خون بہتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا جائے کیونکہ عوام کا خون تو امن کے زمانے میں بھی ارزاں ہوتا ہے انھیں کا خون چوس کر دولت مند طبقہ عیش و فراغت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اس زمانے میں اختر انصاری نے اور بھی کئی مسائلی نظمیں لکھیں قحط بنگال سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک بہت ہی خوبصورت مختصر نظم "کلکتہ" لکھی اپنی عام روش کے برخلاف اس نظم کا اندازِ بیاں ایمائی ہے لہجہ میں لطیف اور چھبتا ہوا طنز ہے۔ اس نظم میں طنز کے اظہار کا انداز بھی خاص ہے۔ ہر شعر کے پہلے مصرعے میں ایک سادہ بیان ہے اور دوسرا مصرعہ طنز کا نشتر بن کر ابھرتا ہے مثلاً

جگمگاتی شاہراہوں کا یہ نور
تیرہ بختوں کا اجالا ہی سہی

اس طنز کو آگے بڑھاتے ہوئے قحط کے بارے میں کہتے ہیں :-

یہ طرب خانوں کی دنیائے نشاط
قحط کے ماروں کی دنیا ہی سہی

پھر کسی تبصرے اور تنقید کے بجائے یہ سوال کرتے ہیں کہ :-

دل کی حیرانی کو ہمدم کیا کروں ؟
اپنی نادانی کو ہمدم کیا کروں ؟

ہندوستان کی آزادی کے بارے میں تقریباً سبھی ترقی پسند شاعروں نے نظمیں لکھیں اور تلخی و تندی کے ساتھ اس احساس کا اظہار کیا کہ یہ حقیقی آزادی نہیں ہے۔ اختر انصاری نے بھی اس نقطہ نظر کو اپناتے ہوئے ایک نظم "طلوعِ آزادی" لکھی۔ اس نظم کا لب و لہجہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں متوازن

ہے۔ بے جا جذباتیت کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ نظم میں ردیف و قوافی کی تنظیم قصیدے کے مانند ہے۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:۔

آج پھر چال چل گیا کوئی
آج پھر مات کھا گئے ہم لوگ

شعر پڑھ کر یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ چال چلنے والا کون ہے اور ہارے مات کھانے سے کیا مراد ہے۔ اس سوال کو ذہن میں ابھار کر اس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں جب ہم آزادی کی جدوجہد میں سرگرم عمل تھے۔ اور بتاتے ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہم نے کیا کیا قربانیاں دیں:۔

سرفروشی و جاں سپاری کے
معجزے تک دکھا گئے ہم لوگ

ضبط و ایثار کے فسانوں کی
ایک دنیا بسا گئے ہم لوگ

ہائے وہ ذوق و شوق دار و رسن
جس کے جادو جگا گئے ہم لوگ

وہ اسیری کی لذتیں جن میں
اپنی عمریں بتا گئے ہم لوگ

نظم اس طرح آگے بڑھتی اور پھر قصیدے کی طرح گریز کا مرحلہ آتا ہے:۔

لیکن افسوس کیا غضب ہے کہ آج
اک نئی چوٹ کھا گئے ہم لوگ

اف رے کید سیاستِ افرنگ
جس کے نرغے میں آ گئے ہم لوگ

یہاں پہنچ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ چال چلنے والا کون ہے اور بظاہر تو ہم کو آزادی کی لڑائی میں کامیابی ہوئی لیکن یہ آزادی کچھ اس شکل میں ہم کو ملی ہے کہ جو توقعات اس سے وابستہ ہم نے کی تھیں پوری نہیں ہوئیں اس طرح کامیاب ہو کر بھی ہم ناکام ہی رہے اور مات کھا گئے۔

تقسیم ہند کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے ان فسادات کے پیچھے اونچے طبقے اور ان کے حواریوں کے مفادات حاصلہ کارفرما تھے۔ فسادات کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس میں نچلے طبقے کے عوام بھی ملوث تھے۔ صاحب فکر دانشور اور اہل دل ادیب شاعر اور فنکار اس قتل وغارت گری سے بے حد ملول اور رنجیدہ ہوئے اور بعض شدید مایوسی کا شکار ہو گئے اختر انصاری کا ردِ عمل بھی شدید مایوسی کی کیفیت لیئے ہوئے ہے۔ فسادات پر انھوں نے جو مختصر سی نظم لکھی وہ نہ صرف ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے بلکہ اُردو میں فسادات سے متاثر ہو کر جتنی بھی نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ نظم ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے فنی اعتبار سے بھی ایک بلند پایہ نظم ہے۔ اس نظم میں اپنے عام انداز سے ہٹ کر اختر انصاری نے براہِ راست اظہارِ خیال سے گریز کرتے ہوئے ایماو اشارے سے کام لیا ہے نظم کا عنوان فسادات ہے لیکن نظم میں کہیں بھی فسادات کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں شاعر اپنے حساس دل کی یہ حالت بیان کرتا ہے کہ :

ستم جب کسی کا خون بہاتی ہے تو اس کا خون بہا اس طرح ادا ہوتا ہے کہ دل کا لہو آنسو بن کر بہنے لگتا ہے۔ دل نے اس زندگی میں توہین ذوق، مرگ تمنا ضیاع حسن غرض ہر طرح کے عذاب سہے۔ دل کی زود حسی کا یہ عالم ہے کہ تتلی کا پر بھی ٹوٹ کر گرے تو وہ مضطرب اور غمگین ہو جاتا ہے۔ لیکن اس دل کی حالت جو آج ہوئی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ایسا شدید صدمہ زندگی میں کبھی نہیں پہنچا تھا کہ جس کے نتیجے میں دل و زبان گنگ ہو جائیں۔ یہ ایسا سانحہ ہے کہ اس نے بڑھ کر کسی سانحے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حالت یہ ہے کہ اب کہنے سننے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ نظم کا آخری شعر شدید طنز اور شدید غم کی ملی جلی کیفیت رکھتا ہے۔

اب کچھ کہے تو مبدء آفات ہی کہے؟
ربِ جہول و خالقِ ظلمات ہی کہے؟

آزادی کے بعد ہمارے شعر و ادب پر جمود کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اختر انصاری کی شاعری میں ایک ٹھیراؤ سا محسوس ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۵۲ء تک انہوں نے بہت کم نظمیں لکھیں اس دور میں وہ جن ذہنی اور قلبی کیفیات سے گذر رہے تھے اس کا اندازہ ان کی نظم "سہاروں کی تلاش" سے ہو سکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ریگ زار تشنگی کی نظر ہو جانے کو ہوں
اے سراب رنگ و نور و کیف و بولینا مجھے

ایک خواب مرگ طاری ہو رہا ہے روح پر
اے طلسم نائے و نوش و ہاؤ ہو لینا مجھے

دل کشاکش سے تہی خالی ہے کاوش سے جگر
اے فسوں سعی و جہد و جستجو لیتا ہے مجھے

ہے عجیب اک ہولناک افتادگی کا سامنا
تھامنا فکر و تخیل کے سہارو! تھامنا

اس دور میں انھوں نے چند نظمیں غیر سیاسی موضوعات پر لکھیں۔ ۱۹۶۴ء سے ان کی شاعری میں پھر ایک موڑ آتا ہے۔ اور وہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل سے از سر نو دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اس زمانہ میں انھوں نے چند کامیاب نظمیں لکھیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر نظم "معبد ویران" ہے۔ یہ ایک علامتی نظم ہے۔ معبد ویران ایک اچھوتی اور معنی خیز علامت ہے۔ جو انفرادی تجربے سے ابھر کر آفاقیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے یہ ایک ویران مسجد کی تصویر ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ مسجد میں ایک گھسی پٹی چٹائی بچھی ہے۔ در و دیوار شکستہ ہیں گنبد و مینار کا تو ذکر کیا چھت بھی غائب ہے چھت کی جگہ آفات کا سایۂ پرنور ہے۔ وضو کے لئے پانی کا انتظام نہیں کسی نے اگر یہ سوال کیا کہ وضو کے بدھنے کہاں ہیں تو جواب ملتا ہے کہ یہاں وضو کی ضرورت نہیں۔ شاعر اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اس احتیاط کی ماری ہوئی عبادت میں
عذاب پہنچا کسی کو نہ کچھ ثواب ملا
غرض کے خیر سے ہم خانماں خرابوں کو
خدا بھی اپنی طرح خانماں خراب ملا

اور نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے: ۔

خرابیوں کی یہ ہے انتہا خدا رکھے
شریک طالع بد ہے خدا خدا رکھے

یہ نظم ایک شہر آشوب کی کیفیت بھی رکھتی ہے۔ جس میں خدا کو شریک طالع بد قرار دے کر طنز کو کمال پہ پہنچا دیا ہے۔ جب خدا ہی خاناں خراب ہے تو ہماری خاناں خرابی کس شمار میں آ سکتی ہے۔

نظم نگاری کے لئے اختر انصاری نے جو سانچے استعمال کئے ہیں ان میں خاص تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی تمام نظمیں پابند سانچوں میں ہیں۔ انہوں نے ایک بھی آزاد یا معریٰ نظم نہیں لکھی۔ البتہ ردیف و قوافی کی ترتیب و تنظیم میں کچھ اختراعیں کی ہیں۔ ان کی چند نظمیں جو مثنوی اور قصیدے کے روایتی سانچوں میں ہیں مثلاً تم اور ہم، لبنت، مغنیہ سے، دل کی دنیا، سہاروں کی تلاش، اودے شنکر وغیرہ غزل یا قصیدے کے مانند ہے۔ جب کہ شباب، دوپہر، جواں مرگ شاعر، خواب، محبت سے پہلے، شام اور چند دوسری نظموں میں ردیف و قوافی مثنوی کے انداز میں ہر شعر کے بعد بدلتے گئے ہیں اختر انصاری کی بہت سی نظمیں بندوں پر مشتمل ہیں زیادہ تر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایک نظم میں جتنے بند آئیں ان میں مصرعوں کی تعداد مساوی ہو اور ایک بند میں قوافی کی جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ آخر تک برقرار ہے۔ بعض بندوں کی نظموں کے آخر میں صرف ایک مطلع نما لایا گیا ہے۔ بعد والی نظموں میں قوافی کی ترتیب کے فرق سے جو مختلف سانچے استعمال ہوئے ہیں ان کا اندازہ ذیل کے نمونوں سے ہوگا۔

بندوں میں قوافی کی ترتیب ۔ مثالیں

۱۔ اااا / ب ب ب ب	مغنیہ
۲۔ ااااا / ب اب اب اب	نہرو کی وصیت
۳۔ ااب ب / ج ج ب اب	گائے جا۔
۴۔ اااب ب / ج ج ج ب ب	اس بار میں جانا ہے ضرور
ااااب / ج ج ج ب	آج کے شاعر کا گیت
۔ا۔ا / ۔ب۔ ب	ناسنزا۔ کون۔ لتا منگیشکر
۔ا۔ا۔ا / ۔ب۔ ب۔ ب	ستم کی خدائی
اب اب اا / ج دد ج	ڈھولک کا گیت
اب اب ا / ج دد ج	یہ جہاں
ااب ب ج / دد ہ ہ ج	آج سے ہم بھی اپنے نہیں
اب اب ج / اب اب ج	روداد فکر و عمل
ااا / ب ب ب	ایک تاثر
اب ب ب۔ ج ج / د ہ ہ د د	فیصلہ

مختصر

بعض نظمیں ایک بند اور ایک شعر پر مشتمل ہیں۔ ان میں بھی قوافی کی ترتیب سے سانچوں کے مختلف نمونے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

۔ا۔ا / ب ب	فطرت
ااب اب ج ج دد / ہ ہ	شباب
ا۔ا۔ا۔ا۔ا۔ا / ب ب	کلکتہ
اا۔اا۔ا / ب ب	فسادات

ایک نظم مونالزا کا سانچہ بالکل اچھوتا اور دلچسپ ہے عام روایات کے برخلاف

اشعار کے ابتدائی مصرعوں میں بھی ردیف و قوافی لائے گئے ہیں۔ اس نظم میں قوافی کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

اب اب اب اب اب اب

ہم دیکھتے ہیں کہ قوافی کی ترتیب و تنظیم میں ردوبدل کے ذریعہ اختر انصاری نے نظموں کے لیئے نئے نئے سانچے وضع کیے ہیں چند ایک نظموں میں قوافی کے علاوہ اوزان کے استعمال میں بھی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے گیت اور مستزاد کے سانچوں سے استفادہ کیا ہے مثلاً ان کی نظم " اک ستارہ " تین بندوں پہ منقسم ہے ہر بند میں چھ مصرعے ہیں۔ نظم میں بحر رمل استعمال کی گئی ہے اور اس کے ارکان کی تعداد میں کمی بیشی کرتے ہوئے عجیب طرح کا آہنگ تشکیل دیا گیا ہے۔ پہلا بند یہ ہے:-

ایک طوفانی بھیانک سخت کالی رات ہے
دھر پہ چھائی ہوئی
کوئی ناگن جیسے بل کھائی ہوئی
موت جیسے سر پہ منڈلائی ہوئی
دھر پہ چھائی ہوئی
روحِ انسانی کو لرزا دینے والی رات ہے

اس بند میں ارکان کی ترتیب ملاحظہ ہو:-

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
فاعلاتن فاعلن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
فاعلاتن فاعلن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

باقی دو بند بھی اسی نمونے پر ہیں اور ہر بند میں دوسرے مصرع کو اسی طرح دو دو ہرایا گیا ہے۔ تین بندوں کے بعد آخر میں یہ اکہرا شعر لایا گیا ہے۔

دیکھتا یا رو یہ گر توں کا سہارا تو نہیں
یہ ستارہ اپنی قسمت کا ستارہ تو نہیں

وزن = فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

ایک اور نظم "ہماری بلا سے" میں بھی ہر بند میں ایک مستزاد نما مصرع لاکر آہنگ میں کسی قدر ندرت پیدا کی گئی ہے۔ اس نظم میں بھی چھ چھ مصرعوں کے تین بند ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو :-

وہی زندگی ہے وہی مشغلے ہیں
وہی طبع پر جوش کے ولولے ہیں
امنگیں وہی ہیں وہی حوصلے ہیں
اگر ہے گرانی فسردل انتھا ہے
ہماری بلا سے
کہ ہم سب سابق جیسے جا رہے ہیں

پانچوں مصرع میں دو ارکان حذف کر دیئے گئے ہیں۔ باقی دو بند بھی اسی نمونے پر ہیں۔ مستزاد نما ٹکڑا اور آخری مصرع ہر بند میں دوھرایا گیا ہے۔ ایک نظم " اے دل بے کاسہ مست" کے ہر بند میں تین ہم قافیہ اس وزن میں ہیں :-

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

چوتھا مصرع ۔ اے دل بے کاسہ مست (فاعلاتن فاعلن) مستزاد نما ہے۔ ہر بند کے آخر میں یہ ٹکڑا لایا گیا ہے۔ باقی تمام بندوں میں پہلے دو مصرع ہم قافیہ ہیں اور تیسرے مصرعے میں ٹیپ کے مصرع کا قافیہ لایا گیا ہے۔

مثنوی درد و داغ

مثنوی اصل میں طویل نظم ہوتی ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے بعد قافیہ بدل جاتا ہے۔ جدید دور میں مثنوی نگاری کا رواج نہیں رہا۔ ویسے بعض شعراء نے مثنویاں لکھی ہیں اور مثنوی کی روایت کا التزام بھی رکھا ہے۔

اختر انصاری نے ۱۱۹۲ اشعار کی اس طویل نظم کو مثنوی کے سانچے میں لکھا ہے صرف اس قدر جدت کی ہے کہ اسے بندوں کی شکل دے دی ہے ایسا نہیں ہے کہ مثنوی کا مضمون تو مسلسل ہے اور چند اشعار کے بعد کسی وجہ سے بغیر فصل دے کر بند قائم کر دیئے گئے ہیں اس کے برخلاف ہر بند ایک پیراگراف کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مضمون کے کسی ایک نکتے کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر دوسرا نکتہ بیان کرنا ہوتا ہے تو پیراگراف بدل دیا جاتا ہے اس طرح مثنوی کے سانچے میں یہ ایک نیا اور کامیاب تجربہ ہے۔ ردیف اور قوافی کے سلسلے میں بھی اختر انصاری نے جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے بعض بندوں میں مثنوی کے اصول کے مطابق ہر شعر کے قوافی جداگانہ رکھے گئے ہیں لیکن پورے بند میں شروع سے آخر تک ایک ہی ردیف برقرار رکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں مکمل ردیف کے بجائے اس کے ایک حرف کو قائم رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بند کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اندوہ جہاں اور غم عشق کے داغ
زہراب حیات اور سم عشق کے داغ

مضمر ہے جو ہر زہر میں اس ظلم کے داغ
جو کم نہیں اس دھر میں اس ظلم کے داغ
ٹوٹا جو کیا عمر بھر اس قہر کے داغ
برسا جو کیا روح پر اس قہر کے داغ

اس مثنوی میں بحر ہزج کا یہ وزن استعمال کیا گیا ہے۔

مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ فعول

اور کہیں زحافات بدل کر یہ اوزان لائے گئے ہیں :۔

مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ فعل

مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع

موضوع کے اعتبار سے بھی اس مثنوی میں عام روایت سے انحراف ملتا ہے اس میں نہ کوئی داستان بیان کی گئی ہے اور نہ اخلاقی مسائل کو حکایات اور تمثیلوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ مثنوی میں حیات انسانی کے مسائل اور خاص طور پر ہماری سماجی زندگی کی خرابیاں غربت جہالت عوام کی بدحالی وغیرہ کی تصویر کھینچ کر اس صورتِ حال کو بدلنے کی خواہش اور عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔

مثنوی کے آغاز میں شاعر اندوہ جہاں اور غم عشق کی روداد بیان کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اگرچہ زندہ ہوں لیکن اب زیست پر ایمان نہیں رہا۔ ارمان و تمنا کے سارے کھیل کھیل چکا ہوں لیکن مجھے میرے دل کے لہو رونے کی لذت نہیں ملی۔ زمانہ میرے درد کو سمجھ نہیں سکا اور مجھے جنس وفا کی کوئی قیمت نہیں ملی۔ میری دل سوزی بیکار گئی اور میں زندگی بھر صحرا کی طرح سلگتا ہی رہا۔

میری ساری زندگی خواب دیکھنے میں صرف ہو گئی ان خوابوں کی تفصیل۔
شاعر کی زبانی سنیئے :-

وہ خواب کہ انسان خدا ہو جائے
ناپید زمانے سے خطا ہو جائے
وہ خواب کہ ہر خواب حقیقت بن جائے
ہر عشرت نایاب حقیقت بن جائے
وہ خواب کہ نبیوں نے بھی دیکھے نہ کبھی
ولیوں نے وصیوں نے بھی دیکھے نہ کبھی

اس کے آگے وہ بتاتا ہے کہ میرے خوابوں نے مجھے کسی سانچے میں ڈھلنے نہ دیا
اور میں روح میں ناسور لیئے الجھی ہوئی راہوں میں بھٹکا کیا۔ میرے دل
میں بے شمار داغ تپکتے اور لو دیتے رہے پھر وہ غموں کی ایک طویل فہرست
گناتا ہے۔ اندوہ جہاں، غم عشق، زہراب حیات، زمانے کے ظلم وستم، تقدیر
کے الطاف، جواں مرگ تمنائیں، محنت جاں سوز تھی دستی بے توفیقی) وغیرہ۔
اس طرح غم کے تھپیلوں نے مجھے دم لینے کی بھی فرست نہ دی میری کاوشوں
کا کوئی پھل نہ ملا۔

بوتا ہی رہا فصل نہ کاٹی میں نے
قبر اپنی انہیں ہاتھوں سے پاٹی میں نے

آخر اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اس دنیا کی بنیاد ہی ناکارہ ہے گردش نے اسے ہمیشہ
بے حال رکھا اور وہ ہمیشہ فلک کے جور و ستم سہتی رہی۔ جو کچھ کسر رہ گئی تھی تو
عفریت صفت انسانوں نے اسے پورا کر دیا اور دنیا میں جہنم کے مزے آنے
لگے۔ انسان کی ہوس انسان کو ڈسنے لگی۔ لاشوں پہ قصر و ایوان تعمیر کیئے گئے

چاروں طرف نوچ کھسوٹ ہونے لگی القصہ وہی انسان جو وجہ ظہور تھا اب زمانے کے جگر کا ناسور بن گیا۔ اس دریا میں انسانوں کی اکثریت ناداری عسرت اور فرسودہ عقاید ورسوم اور اونچے طبقے کے مظالم کا شکار ہے۔ غریب عوام دن رات مفلسیوں میں بھٹکتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو نیلام پہ چڑھا کر تہذیب کی کشتی کھیتے ہیں۔ ان کے بچے جس حال میں پرورش پاتے ہیں اسے شیطان بھی دیکھے تو زمین میں گڑ جائے اور با حمیت انسان قدرت کی اس ستم گری کو دیکھ کر خدا سے منحرف ہو جائے۔ زمین شق ہو اور گنبد افلاک میں دراڑ پڑ جائے۔ یہاں تک کہ فرشتے بھی جنت سے بھاگ کھڑے ہوں ان غریبوں کی عورتیں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس زندگی بھر ہر طرح کے مصائب جھیلتی ہیں۔ غریب دوشیزاؤں کا یہ حال ہے کہ ان کی جوانی پروردۂ الام ہے ان کے دن خزاں دیدہ بہاروں اور راتیں الم افروز نظاروں کے جلوس ہیں۔

یہ سارے منظر دیکھ کر جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہاں سے بھاگیں پرندوں کی طرح اڑ کر کسی اور جہاں میں جا بسیں۔ اس ارض کہن سے ناتہ توڑ دیں اور کسی فردوس بریں میں پہنچ جائیں جہاں آسمان کے یہ ستم نہ ہوں۔ کنواری فضا اور اچھوتی زمین ہو۔ لیکن تخیل کی یہ اڑانیں لاحاصل ہیں کیونکہ اس دنیا سے نکل بھاگنا ناممکن ہے۔ ہم کو یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے پھر کیوں نہ ایسی تدبیر کریں کہ دنیا کی یہ حالت بدل جائے نظم حیات میں ایسا انقلاب لایا جائے کہ محرومی و نومیدی اور مجبوری و معذوری اور تمام رنج و الام محو ہو جائیں۔ زندگی کی آسائشیں سب کے لئے عام ہو جائیں۔ زمانے میں محبت کے چشمے رواں ہوں۔ لوگ جینے کی طرح جی سکیں۔ غم دوراں کے بخیے ادھڑ جائیں مردہ نظریات اور فرسودہ روایات سے چھٹکارا مل جائے۔ اس قاعدۂ

مرگ مسلسل کی جگہ جینے کی نئی روش ایجاد کریں۔ اس تمنا اور آرزو میں ہم کو کسی اور عالم کی تلاش رہتی ہے۔ نئی دنیا ہو اور نیا آدم ہو۔

اس مثنوی کا انداز شروع سے آخر تک بیانیہ ہے روکھا پھیکا موضوع اور مروّج اخلاق اور سماجی تصورات ہیں۔ اس کے باوجود پیرایہ اظہار نہایت موثر اور شگفتہ ہے۔ تشبیہات تازہ و برجستہ ہیں۔ خطابت ہے لیکن شعریت سے معمور۔ مثنوی لکھ کر اختر انصاری نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ مختصر اصناف سخن پر جیسی قدرت رکھتے ہیں طویل اصناف میں بھی اپنے کمال کا جوہر نمایاں کر سکتے ہیں۔

کتابیات

اثر جعفر علی خاں "نغمۂ روح پر ایک نظر" ادبِ لطیف لاہور جنوری ۱۹۳۷ء

مصنف	کتاب	مقام	سال
احمد ندیم قاسمی	رم جھم	لاہور	
اختر انصاری	نغمۂ روح	بدایوں	۱۹۳۳ء
————	افادی ادب	دہلی	۱۹۲۱ء
————	خوناب	لاہور	۱۹۴۳ء
————	خندۂ سحر	دہلی	۱۹۴۴ء
————	ایک ادبی ڈائری	لاہور	۱۹۴۴ء
————	آبگینے	دہلی	۱۹۴۵ء
————	تیرطھی زمین	کراچی	۱۹۶۳ء
————	سرورِ جاں	کراچی	۱۹۶۳ء
————	پیرطاؤس	دہلی	۱۹۶۵ء
————	روحِ عصر		
————	مطالعہ و تنقید		
اختر انصاری	خود نوشت حالات	علیگڑھ میگزین شمارہ خصوصی ۱۹۷۰ء	
————	[illegible] نجم	دہلی	۱۹۷۱ء
جاں نثار اختر	نغمۂ بتاں		
اسیر لکھنوی	دیوانِ اسیر	لکھنؤ	۱۸۷۰ء

اصغر گونڈوی — نشاطِ روح — لکھنؤ ۱۹۷۰ء

اعجاز حسین ڈاکٹر — مختصر تاریخ ادب اردو

اقبال، شیخ محمد — کلیاتِ اقبال — دہلی

انشاءاللہ خاں انشاء — کلیاتِ انشاء — لکھنؤ ۱۹۸۶ء

اکبر الہ آبادی — کلیاتِ اکبر الہ آبادی

پرکاش پنڈت — بہترین رباعیات اور قطعے

جگر مراد آبادی — شعلۂ طور — دہلی ۱۹۳۷ء

خواجہ الطاف حسین حالی — مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۵۳ء)

حسرت موہانی — کلیاتِ حسرت موہانی (مرتبہ عشرت رحمانی) دہلی ۱۹۵۹ء

خلیل الرحمٰن اعظمی — اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ زاویہ نگاہ ۔گیا ۱۹۶۶ء

خلیل الرحمٰن اعظمی — رسالہ ہماری زبان ۲۲۔ مارچ ۱۹۵۷ء

خواجہ میر درد — دیوانِ درد — لکھنؤ ۱۹۰۳ء

ذوق، شیخ ابراہیم — دیوانِ ذوق — لکھنؤ ۱۹۲۳ء

سودا، مرزا رفیع — کلیاتِ سودا — کانپور ۱۹۱۶ء

شاد نرلیش کمار — قاشیں — دہلی، ستمبر ۱۹۶۷ء

شجاعت علی سندیلوی — امیر خسرو اور اُن کی ہندی شاعری

شمس الدین محمد بن قیس الرازی — المعجم فی معائر اشعار عجم

علی بن محمد — دقائق شعر

عبادت بریلوی — غزل اور مطالعہ غزل

——— — اردو تنقید کا ارتقاء

مصنف	کتاب / مضمون
عندلیب شادانی	ترانہ، دوبیتی، رباعی ۔ تحقیقات ۔ بریلی
———	"ایک تابناک ستارہ ۔ ساقی ۔ کراچی ستمبر ۱۹۳۸ء
غالب اسداللہ خاں	دیوانِ غالب (مرتبہ مالک رام) دہلی ۱۹۵۷ء
فانی شوکت علی خاں	کلیاتِ فانی (مرتبہ حیرت بدایونی) حیدرآباد ۱۹ ء
فیض احمد فیض	دستِ صبا دہلی ۔ جنوری ۱۹۷۳ء
کیفی چڑیا کوٹی (مرتب)	جواہرِ سخن
محمد حسن	نئے اسالیب نظم "آجکل دہلی یکم مئی ۱۹۴۹ء
———	اُردو میں رومانوی تحریک
مرزا ادیب	ادبِ لطیف (افسانہ نمبر) ۱۹۳۶ء
مسعود احمد قریشی	"اختر انصاری پر ایک نظم" ادبی دنیا لاہور فروری ۱۹۴۶ء
مومن خاں مومن	کلیاتِ مومن لکھنؤ
میرا جی ثناءاللہ خاں	آبگینے پر تبصرہ ادبی دنیا لاہور ستمبر ۱۹۴۱ء
میر محمد تقی	کلیاتِ میر (مرتبہ عبادت بریلوی)
نجم الغنی	بحر الفصاحت ۔ لکھنؤ
نظیر اکبر آبادی	کلیاتِ نظیر اکبر آبادی ۔ لکھنؤ
نظیر صدیقی	"جدید غزل پاکستان میں اور ہندوستان میں" فنون لاہور (غزل نمبر)
وارث کرمانی	"اختر انصاری کی شاعری" دوامِ ٹانڈہ جولائی، اگست جنوری ۱۹۶۹ء
وحید اختر	"پیرہنِ اُوس پر تبصرہ" ہماری زبان علیگڑھ ۱۵ر اپریل ۱۹۶۸ء
ولی	کلیاتِ ولی (احسن مارہروی) اورنگ آباد ۱۹۶۷ء
یوسف حسین خاں ڈاکٹر	اُردو غزل

اخترانصاری کی شاعری

کا

تنقیدی مطالعہ

فاطمہ پروین

بی۔ ایس سی ایم۔ اے، ایم فل (عثمانیہ)

اختر انصاری ۱۹۰۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اینگلو عربک ہائی اسکول اور سینٹ اسٹیفن اسکول میں ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ والد کی اچانک موت کے سبب تعلیم نامکمل چھوڑکر وطن لوٹ گئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ٹی اور ایم۔اے کے امتحان پاس کیے۔ ۱۹۴۴ء تک مسلم یونیورسٹی کے سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۱ء یعنی اپنے سبکدوش ہونے تک یونیورسٹی کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں لکچرر رہے۔ اختر انصاری نے ۱۹۲۸ء میں شاعری شروع کی۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نغمۂ رُوح" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء تک ان کے کم وبیش دس شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اختر انصاری نے تاثراتی افسانے کی بنیاد ڈالی۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دَور میں ان کی تصنیف "افادی ادب" کو ترقی پسند نظریۂ شعروادب پر بہترین مقالہ تصور کیا گیا۔ "ایک ادبی ڈائری" اس سلسلہ کی ایک عہد آفریں تصنیف ہے۔ اختر انصاری نے خالص علمی موضوعات پر بھی کام کیا ہے۔ "غزل اور درسِ غزل" اس خصوص میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔

اختر انصاری نے غالب کی بعض مزاحیہ تحریروں کو انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ ادب اور تعلیمات کے ضمن میں اختر انصاری کی انگریزی تصانیف نے علمائے مغرب سے بھرپور خراجِ عقیدت حاصل کیا۔